

دریا ہے چشمِ گریہ ناک

(ناول)

شفق سوپوری

دریا ہے چشمِ گریہ ناک

(ناول)

شفق سوپوری

دریا ہے چشمِ گریہ ناک

شفق سو پوری

Handwritten text in a script, possibly Urdu or Persian, appearing as a faint, illegible mark.

Handwritten text in a script, possibly Urdu or Persian, appearing as a faint, illegible mark.

دریا ہے چشمِ گریہ ناک

(ناول)

شفق سوپوری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں۔

DARIYA HAI CHASHM-E-GIRYA NAK

(Novel)

Edited by

Dr. Shafaq Sopori

ISBN 978-93-91238-91-9

PRICE: Rs.400/-

نام کتاب :	دریا ہے چشم گریہ ناک (ناول)
مؤلف :	ڈاکٹر شفق سوپوری
سن اشاعت :	۲۰۲۱ء
قیمت :	۴۰۰ روپے
صفحات :	۱۶۰
مطبع :	روشان پرنٹرز دہلی-۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.o. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)

B.o. 3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph : 45678203, 45678285, 45678286, 23216162

E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

انتساب:

اپنے استاد محترم پروفیسر حامدی کاشمیری کے نام
جن کی جوتیاں سیدھی کر کے میں اس مقام تک پہنچا ہوں۔

ہم تھے اور دھوپ کی نماز تھی
راستے میں چنار بھی آئے
(حامدی کاشمیری)

مصنف کی تصانیف

- دلِ خاکِ بسر (غزلیات)
- بیتے موسموں کے دکھ (نظمیں اور گیت)
- دشت میں دور کہیں (غزلیات)
- ریشمِ سرابِ خواب (غزلیات)
- اردو غزل اور ہندوستانی موسیقی (تنقید و تحقیق)
- موسیقی، شاعری اور لسانیات (تحقیق)
- مخزنِ موسیقی (تحقیق)
- کلامِ فیض کا عروضی مطالعہ (تحقیق)
- جہات (تنقید)
- غمِ طاؤس: فن اور شخصیت (تنقید و تحقیق)
- نیلیما (ناول)
- فائرنگ رینج: کشمیر ۱۹۹۰ء (ناول)
- موسیٰ (ناول)
- شکفتا نے (طنز و مزاح)
- اشاریہ ”شیرازہ اردو“: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز (تحقیق)

○ دریا ہے چشم گریہ ناک (ناول)

○ لفظ عروض اور شاعری (تحقیق)

○ فرہنگِ موسیقی (فرہنگ)

Glossary of Terminology (Music) ○

اس ناول کا کوئی بھی حصہ ناول نگار سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کمرشیل استعمال مثلاً آڈیو، ویڈیو وغیرہ کے لئے نہیں کیا جاسکتا۔ خلاف ورزی کی صورت میں قانونی چارہ جوئی کا حق ناول نگار کے پاس موجود ہے۔

(ڈاکٹر شفق سوپوری)

اس ناول کے سب کردار، واقعات اور مقامات فرضی ہیں۔ کسی بھی قسم کی مماثلت محض اتفاق ہو سکتا ہے جس کے لئے ناول نگار پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔

(ڈاکٹر شفق سوپوری)

Glossary of Terminology (Hindi)

1. अक्षर (Alphabet) - The basic unit of writing in Hindi, consisting of 46 characters (28 vowels and 18 consonants).

2. वाक्य (Sentence) - A group of words that express a complete thought or statement.

3. शब्द (Word) - A single unit of language that carries meaning.

4. अर्थ (Meaning) - The sense or interpretation of a word or sentence.

(Hindi)

5. व्याकरण (Grammar) - The study of the rules and structure of a language.

6. लेखन (Writing) - The process of putting words and sentences together to form a coherent text.

7. पठन (Reading) - The process of understanding and interpreting written text.

(Hindi)

اس ناول میں

”دریا ہے چشم گریہ ناک“، ”نیلما“ اور ”فائرنگ ریج کشمیر: ۱۹۹۰“ کے مصنف ڈاکٹر شفق سوپوری کا تیسرا ناول ہے۔ کہانی ایسے گاؤں کے منظر سے آغاز پاتی ہے جو سلطنت کے دو صوبوں کو ملانے والی سڑک پر دامن کوہ میں آباد ہے۔ یہ سانپوں کو چٹان پر پھٹکارنے والے بالک ادھم سنگھ کا گاؤں ہے۔ جی، اُسی ادھم سنگھ کا جس کی ماں سانپ کے ڈسنے پر منہ سے جھاگ اگلتے ہوئے پر لوک سدھار گئی تھی۔ جس کے باپ کی شکل اور حرکتیں مہاراجہ کے اضطبل میں رہ کر گھوڑوں جیسی ہو گئی تھیں۔ یہی ادھم سنگھ بعد میں مہاراجہ کی فوج میں بھرتی ہو کر اتنا مقرب ہوا کہ مہاراجہ کو اس کی آنکھوں میں خون کا وہ لوتھڑا نظر آتا تھا جو چنگیز خان اپنی ماں کی کوکھ سے مٹھی میں بھر کر لایا تھا۔ یہ کہانی محض ادھم سنگھ کی نہیں آنکھ بھر ٹوکری، ساون بھر آنسوؤں، آسمان بھر بھوک اور کائنات بھر گالیوں کی بھی ہے۔

اس کہانی میں مہارانی کا وہ بھیانک خواب ہے جسے سن کر نرودیراج جیوتشی ”ادھرم، ادھرم، وناش، وناش، اوم شانتی اوم“ بدبایا تھا اور جس کا پائے اس کی نظر میں تھا ”ادھرمیوں کا سر وناش۔“

ادھرمیوں کے سر وناش کے لئے ادھم سنگھ کی تلوار تھی۔ تیز دھار تلوار ادھرمیوں کے سینوں میں اترتی اور گردنوں کے ختنے کرنے کے بعد رانی ماتا کے پاؤں میں بچھتی تھی۔

اس ناول میں گلناز کی کہانی بھی ہے جس نے دھاڑیں مار مار کر روتے جلال الدین کا سراپنی گود میں رکھتے ہوئے اسے سونے کو کہا تھا کہ خدائی سو گئی تھی۔ یہ اس بے خبر خدائی کی کہانی بھی ہے جو سو گئی تو مندر کی گھنٹی کی زنجیر سے ”اللہ اکبر“ کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ یہ اسی جلال الدین کی کہانی ہے جس نے کشوری لال کے بیٹے ست لال کے کنبے کو پناہ دی تھی اور گلناز کے حلقوم سے نکلنے والی اس بھیا نک چنچ کی بھی جسے سن کر حملہ آور کا پنتے ہوئے بھاگ نکلے تھے۔ یہ جان محمد ملک، عائشہ بی بی اور ان کے بچوں کی کہانی ہے جن کے گھر سے کلہوڑوں عرف کلونے بدوق کے دھماکے سنے تھے تو اس کے ہاتھ سے لالین گر گئی اور حلقوم سے چنچ بلند ہوئی تھی اور خدا بخش چاچا اور کپٹن مہر سنگھ جیسے کرداروں کے علاوہ ریشماں بی بی کی بھی جو شوہر کی لاش پر دھاڑیں مار مار کر روئی تھی مگر بچوں کی لاشیں پھٹی آنکھوں سے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھیں۔ یہ کیسی کہانی ہے کہ اس میں وہی بلوائی ٹھہرتے ہیں جن کی بستیاں جلا کر راکھ کر دی گئی تھیں، جن کے بچے، جوان اور بوڑھے بزرگ قتل کیے گئے، جن کی عورتوں کی عصمتیں تار تار ہوئیں اور جن کی عبادت گاہیں اصطبل بنا دی گئیں کہ یہ اصطلاح مہاراجہ کے دربار سے اُن کے لیے سکھم چند لایا تھا۔

اس ناول میں ایک ایسی بستی ہے جو مہارانی کے لئے بتیس دانتوں میں درد اچھالتے ایک دانت جیسی ہو گئی تھی۔ یہ ناول چندر لیکھا کی کہانی بھی سمیٹے ہوئے ہے، اُس نبھاگی چندر لیکھا جیسی چندر لیکھا کی جس کو بچانے کے لئے سوراس کو اپنے پرانوں کی آہوتی دینی پڑی تھی مگر جسے بچانے والا کوئی نہ تھا اور وہ مولوی سے التجا کر رہی تھی کہ اُسے اپنا لے۔ ان سب کہانیوں کے درمیان انسانی تاریخ اور تہذیب سے آکر کئی کہانیوں کے دھارے ملتے رہتے ہیں اور موضوع کی گھمبیر تائیں اضافہ کرتے ہوئے ایک الگ نوع کا

بہاؤ ہو جاتے رہے ہیں۔ محقق شفق ایسے میں اس ناول نگار کے بہت کام آیا ہے اور شاعر شفق نے بیانیہ کا وہ قرینہ ڈھونڈ نکالا ہے کہ مختلف ابواب میں بنی ہوئی کہانی ایک ہو جاتی رہی ہے۔ ایسی کہانی پر میر صاحب سے مستعار لے کر یہی عنوان جمایا جاسکتا تھا: ”دریا ہے چشم گر یہ ناک۔“

میں نے یہ ناول پوری توجہ سے پڑھا ہے اور جب میں اس کے اختتام پر پہنچا، وہاں جہاں زمین پر بے گناہوں کی لاشیں بچھ گئی تھیں اور خون کا سیلاب بہا تھا، مہارانی محل میں دیپاول منار ہی تھی اور شہر سے دور کتے اور بھیڑیے لاشوں کو جبرؤں میں دبائے ادھر ادھر گھسٹتے پھر رہے تھے، تو وہاں میر صاحب کے ایک اور مقبول شعر کا مصرع ثانی ”مڑگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا“ گڈ مڈ ہونے لگا تھا جہاں سے اس ناول کا عنوان اٹھایا گیا تھا۔

شفق سوپوری نے اس ناول کو لکھنے اور ایک نہایت نازک موضوع کو برتنے کے لئے بیانیے کا جو قرینہ چنا ہے، اس نے کہانی میں ایک دھند سی پیدا کر دی ہے۔ ایسی دھند جس میں کئی بھید ہیں جو ناول پڑھنے والے پر کچھ وقت لے کر کھلتے چلے جاتے ہیں، کچھ اس طرح کہ کہانی کا ہر کردار دیکھا بھالا لگنے لگتا ہے۔ مجھے یقین ہے شفق سوپوری کا یہ ناول بھی ان کے پہلے ناولوں کی طرح بہت توجہ پائے گا۔

محمد حمید شاہد

اسلام آباد (پاکستان)

آج کل سے کچھ نہ طوفاں زا ہے چشم گریہ ناک
 موجزن برسوں سے ہے دریا ہے چشم گریہ ناک
 (میر تقی میر)

ادھم سنگھ

سانپوں کو چٹان پر پھٹکارنے والا بالک

Handwritten text in Urdu script, likely bleed-through from the reverse side of the page. The text is faint and mostly illegible due to the quality of the scan and the nature of the bleed-through.



چھایا پور — شہر سے لگ بھگ ستر کوس دور شمال میں سلطنت کے دوصوبوں کو ملانے والی سڑک پر دامنِ کوہ میں آباد ایک چھوٹا سا گاؤں جہاں مندروں میں بنجنے والی گھنٹیوں کی جلتنگ اور مسجدوں کے میناروں میں گونجنے والی اذانوں کی گمگ سے سویرا جاگ جاتا — پھر سویرا جاگ جاتا تو پرندوں کی منقار مضراب بن کر ہوا کے تار چھیڑتی۔ چولھوں سے دھواں اٹھتا تو ہاتھوں پر پھیلنے والی روٹیوں کی تھاپ پر پھنکنیوں کے ٹر بنجنے لگتے۔ اور توؤں پر پکنے والی روٹیوں کی خوشبو کے ساتھ کھیت کھلیانوں سے اٹھنے والی کسانوں کے پسینے کی سوندھی سوندھی مہک پگھٹ پر کنواری گوریوں کے نرم گرم پہلوؤں سے اترے ہوئے مٹی کے کورے برتنوں میں پانی کی سنسناہٹ جگاتی۔

شام کو کھیت سے لوٹنے والی بیل گاڑی جب کچے راستے پر ہچکولے کھاتی تو بیل کے گلے میں کھنکتی گھنٹی کی تان سے جوان سینوں میں ہوک اٹھتی۔ کچی جوانی جب لکاتے چھپاتے برگد کے تنے پر مہندی سے دکتے ہاتھوں سے سندور مل کے منت کا دھاگا باندھ کے لوٹتی تو دور کھیت کی مینڈ پر بنجنے والی بانسری سے راگ پہاڑی کا برہا داس دلوں میں برما گھمانے لگتا۔ مندر میں دیے جلتے تو راگ درگا کا الاپ تھکن سے چور کسانوں اور برہ کی

آگ میں تپنے والی آنکھوں کو ٹھنڈی نیند کا وردان دیتا۔ ایک دروازے پر دستک ہوتی تو دس کواڑ کھلتے۔ شبہ کاریہ آرمبھ کرنے سے پہلے ملا سے فال نکالی جاتی۔ اور شاستری کو کنڈلیاں دکھا کر ہی بیٹی کا نکاح انجام پاتا۔

ادھم سنگھ کا جنم اسی گاؤں میں ہوا تھا۔ اس کا باپ وکرم سنگھ مہاراجا کے اصطل میں نوکر تھا۔ دن رات گھوڑوں میں رہ کر اس کی شکل گھوڑوں جیسی ہو گئی تھی۔ نچلا ہونٹ موٹا تو تھا ہی اس پر عمر ڈھلنے کے ساتھ کلے کی ہڈیاں بھی ابھر آئیں جس سے چہرہ تکیونی ہو گیا۔ حرکتیں بھی گھوڑوں جیسی کرتا۔ کسی بات پر خوش ہوتا تو ہنسنے کے بجائے ہنہناتا۔ دکھی ہوتا تو گھوڑے کی طرح ہونٹ پھڑ پھڑاتا۔ تو بڑوں سے چوری چھپے گڑ بھی نکال کے کھاتا۔ ان پڑھ تو تھا ہی اس پر جہالت قبر خدا۔ اپنے استاد خدا بخش سے گھوڑوں کی ایال تراشنے کا ہنر سیکھا۔ جس مقرض سے گھوڑوں کی ایال تراشا اسی سے اپنے اکلوتے بیٹے ادھم سنگھ کی حجامت کرتا۔

کھڑے تڑے گھر آتا تو خاک کی رنگ کے سرکاری تھیلے میں گڑ، تمباکو اور نسواری پوٹلیوں کے نیچے مقرض بھی چھپا کر لاتا۔ ادھم سنگھ کو جیسے ہی اپنے باپ کے آنے کی بھنک لگتی وہ بھاگ کے ناہال میں چھپ جاتا جہاں سے وکرم سنگھ شبانہ چھاپہ مار کے اسے پکڑ کر لاتا اور صبح دبوچ کر اس کی حجامت کرتا۔ وہ چیخا چلاتا، روتا بلکتا مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ ہمسائے او بڑ کھا بڑ موتراشی کے اس وحشیانہ عمل کو دیکھ کر ایک تندخو سرکاری اہلکار سے تعرض تو نہیں کر سکتے البتہ یہ ضرور کہتے کہ قدرت نے ماں چھین کر پہلے ہی بالک کے ساتھ انا تھ کیا اب سوتیلی ماں اتیا چار میں کون سی کسر باقی چھوڑتی ہے جو یہ ظالم آکر پوری کرتا ہے۔ حجامت کے بعد ادھم سنگھ بالکل چھچھوند ر لگتا۔ اس کے کھر کھرے بالوں پر لڑکے بالے ہاتھ

پھیر پھیر کر اسے چڑاتے۔ اسکول میں کچھ لڑکے ماسٹر کی طرح چھڑی اٹھا کے اس کے سر کے گلوب پر پہاڑوں، سمندروں، جزیروں اور میدانی علاقوں کی نشاندہی کرتے اور خوب قہقہے لگاتے۔ ماسٹر تو خود اسے دیکھ کر ہنستے وہ بھلا اس کی شکایت پر شریر لڑکوں کی سرزنش کیا خاک کرتے۔ ٹھٹھا خول جب برداشت سے آگے بڑھ گیا تو ادھم سنگھ نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ کبھی کبھی نانہال جاتا تو ماں کو یاد کر کے بہت روتا۔ بوڑھا نانہال چند اسے سینے سے چمٹا کر خود اتنے آنسو بہاتا کہ اس کے چشمے کا محدب شیشہ بھیگ جاتا۔ اس بزرگ نے بیٹی کو وداع کرتے وقت کہا تھا جا بیٹی بھگوان کرے جس گھر میں تیری ڈولی اترے اسی سے تیری ارتھی اٹھے۔ تنک مزاج و کرم سنگھ کے ہاتھوں اس ابلانے کتنے ستم اٹھائے مگر جب میکے جاتی تو کبھی زبان پر حرف نہ لاتی۔ لیکن جس ماں نے نو مہینے کو کھ میں رکھا، اپنی چھاتی سے بھل بھل دودھ پلا کے بڑا کیا، اسے بیٹی کی دردناک نظر نہ آتی؟ چنانچہ اپنے شوہر کو کوستی کہ بیٹی جو تمہارے سینے پر پتھر کی سل کی طرح بوجھ تھی تو کنویں میں کیوں نہ پھینک دیا بے چاری کو۔۔۔ کیوں قصائی کے پلے باندھا؟

اور ایک دن سسرال سے بیٹی کی ارتھی ہی اٹھی۔ سر لا دیوی کو ناگ نے ڈس لیا۔ لوگوں نے غل مچایا کہ کھاٹ لاؤ، کھاٹ لاؤ، اسپتال پہنچاؤ۔ سب کہتے ہی رہ گئے اور سر لا دیوی منہ سے جھاگ کا ریللا اگلنے ہوئے پر لوک سدھاری۔ ماں کی موت کے دوسرے دن ادھم سنگھ نے ادھم مچایا۔ بانیاں کھود کھود کر، پتھر اٹھا اٹھا کر جو سانپ ملا اسے چٹان پر پھینکارنے لگا۔ پورے گاؤں پر دہشت طاری ہو گئی۔ کسی نے پوچھا:

”ارے باؤ لے یہ کیا ناتھ کر رہے ہو؟“

تس پر بولا:

”کیوں اندھے ہو گئے ہو؟ دیکھتے نہیں کہ چٹان کو کوڑے مار رہا ہوں۔“

بارے نہال چند کے سمجھانے بجھانے سے شانت ہو گیا۔ سچ پوچھو تو بیٹے کی یہ وحشت دیکھ کر دھرم سنگھ کے دل میں بھی ہیبت بیٹھ گئی۔ سرلا دیوی کی چٹا بھی سر نہیں ہوئی تھی کہ دھرم سنگھ کے جسم کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے دوسری شادی رچائی۔ ادھم سنگھ کے مزاج میں کج تو تھا ہی اس پر سوتیلی ماں کے اتیاچار سے پاگل پن اور بڑھ گیا۔

ایک دن سوتیلی ماں نے ادھم سنگھ کی شرارتوں کا بھی کھاتا اپنے باپ کے سامنے کھولا۔ اس نے طیش میں آ کر ادھم کو مارنا پیٹنا شروع کیا۔ مار پیٹ کو تو وہ برداشت کرتا مگر بڑھے کی شامت آئی جو غصے میں ادھم کو ماں کی گالی دی۔ ادھم سے ماں کی استھیوں کا اپمان سہانہ گیا۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ دانت پیستے ہوئے پتھر اٹھایا اور بڑھے کے منہ پر دے مارا:

”کھڑ گنجے سالے! ماں کی گالی دیتا ہے تیری ماں کی۔“

پتھر لگنا تھا کہ بڑھے کے منہ سے خون کا فوارا چھوٹا۔ آگے کے تین دانت آگے کے موقعہ واردات پر ہی ٹوٹ کر گر گئے۔ بڑھا شادی بیاہ کے موقعوں پر شہنائی بجاتا تھا۔ اس واردات کے بعد اس کے منہ سے سیٹی بھی نہ نکلی شہنائی کیا خاک بجاتا۔ تو تلانے لگا۔ بات بات پر زبان رخنے سے باہر آ جاتی۔ اس پر ادھم سنگھ طعنہ دیتا کہ بڑھو زبان دراز ہو گیا ہے۔

خدا بخش نے جب دھرم سنگھ کی زبانی ادھم کی کارستانی کا حال سنا تو اپنے افسر سے منت سماجت کر کے اسے اصطبل میں نوکری دلوادی کہ اب لونڈے کا گاؤں میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دھرم سنگھ اس کھٹکے سے مراجار ہاتھا کہ باؤلا کسی بات پر سوتیلی ماں

کی کھوپڑی نہ پھوڑ ڈالے۔ ادھم سنگھ نے جب سنا تو سیخ پا ہوا۔ باپ اگر پیار دلار سے سمجھاتا تو شاید مان جاتا مگر اس نے مار پیٹ اور گالم گلوچ سے زیر کرنا چاہا جو یہ کسی بھی صورت میں ہونے والا نہ تھا۔ دھاڑیں مارتا ہوا نا نہال بھاگا۔ نہال چند روٹی کھا رہا تھا کہ ادھم نے باپ سے بچنے کے لئے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ دھرم سنگھ اور ادھم میں کشاکش ہونے لگی۔ ادھم کے ہاتھ سے نانا کی ٹانگ چھوٹ گئی تو اس نے اس کا دھوتر پکڑ لیا۔ دھرم سنگھ گھٹیتا رہا۔ ادھم کے ساتھ ساتھ نہال چند بھی کھنچے کھنچے پھرنے لگا۔ تو ڈال ڈال میں پات پات۔ بارے نہال چند کا دھوتر کھل کے ادھم کے ہاتھ میں آ گیا۔ بزرگ بھری بھیڑ میں ننگا ہو گیا۔ اپنا پکڑ کھول کے ستر عورت پر رکھا اور منہ پیٹتے پیٹتے بھاگنے لگا۔ اس واقعہ سے ادھم کی کا یا بل گئی۔ سو چا لعنت ہے مجھ پر کہ میری وجہ سے بوڑھے نانا کی بے حرمتی ہو گئی۔ صبح لاری میں بیٹے کو دیکھ کر دھرم سنگھ حیران رہ گیا۔

ادھم سنگھ دنگ تو تھا ہی اس پر چالاک، ہمت اور جرأت سے کچھ ہی برسوں میں اصطل سے نکل کر فوجی افسروں کی رسویوں تک پہنچ گیا۔ وقت، ماحول اور حالات نے مکاری اور چرب زبانی کا درس دیا۔ کچھ فوجی افسروں کے بیٹوں نے پس پردہ اس سے دوستی بھی کر لی۔ پھر وہ واقعہ پیش آیا جس نے ادھم سنگھ کی تقدیر بدل دی۔ ہوا یوں کہ جون کی امس میں کچھ فوجی افسروں کے لڑکے گھڑ سواری کے بعد ندی پر نہانے لگے۔ ادھم سنگھ محافظت پر مامور تھا۔ اچانک ایک لڑکے کا پیر پھسل گیا۔ اسے ڈوبتا دیکھ کر اس کے ساتھی ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ ادھر دھوبیوں نے غل مچایا کہ بچاؤ بچاؤ لونڈا ڈوب رہا ہے۔ ادھم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ندی میں کود گیا۔ لڑکے کی قسمت اچھی تھی کہ ڈوبتے ڈوبتے بچ گیا۔ کنارے پر یہ تماشا دیکھنے کے لئے ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ یہ خبر آگ کی طرح پورے شہر

میں پھیل گئی۔ اچنبہ کی بات یہ تھی کہ ادھم کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ مہارا جانے جب ادھم کی دلیری کا یہ قصہ سنا تو اس کے مزاج کے باب میں تفتیش کی۔ مطمئن ہو کر اسے فوج میں بھرتی کا حکم صادر کیا۔ کچھ دن کے بعد جب ادھم سنگھ فوجی وردی میں ملبوس باپ کے سامنے اکڑ کر کھڑا ہو گیا تو دھرم سنگھ کی آنکھ بھر آئی۔ رندھے ہوئے لہجے میں خدا بخش سے کچھ مکھم کہا اور گھوڑے کی گردن پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ادھم نے فوجی لہجے میں خدا بخش سے کہا:

”چاچا! اسے کہو کہ یہ نائک بند کرے۔ بہت ہوئی اب سائسی۔ گھر جا کر اپنی بیوی کا خیال رکھے۔“

بیٹے کے یہ بول سن کر باپ کے منہ سے روتے ہوئے ایک دردناک چیخ نکلی۔ خدا بخش نے لپک کر سینے سے لگایا۔ دھرم سنگھ نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

”بھائی خدا بخش! سناتم نے لونڈے نے کیا کہا؟“

اس نے منہ بنا کر بیٹے کا جملہ دہرایا:

”اپنی بیوی کا خیال رکھے۔“

پھر اپنے بیٹے کا گریبان پکڑ کر پوچھا:

”کیا وہ تمہاری کچھ نہیں لگتی؟“

ادھم نے گریبان چھڑا کر کڑک لہجے میں کہا:

”نہیں میری کچھ نہیں لگتی۔ ہاں میری ماں کی سوتن لگتی ہے۔“

یہ کہہ کر یہ جاوہ جا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔



بڑھیا

کوٹھے سے اتاری گئی بھیک مانگ کر محصول ادا کرنے والی اتاں



قسمت کا ستارہ جب ڈوبا تو ایک مسکین کے کاندھوں پر وہ بوجھ آن پڑا کہ کمر جھک گئی۔ کمر جھک گئی تو گردن بھی خم ہو گئی۔ نظریں زمین سے لگ گئیں تو احساس ہوا کہ اس کے سر سے ٹوپی اتاری جا رہی ہے۔ تپتی دوپہر میں گزی گاڑھے کے کفن میں جھلستے بدن پر جب پسینے کی بوندیں سرسرا نے لگتیں تو چڑی پر کھل کے کھریرا پھیرنے کو من کرتا۔ سر کی ٹوپی گرانے والے کی طرف بڑھایا ہوا ہاتھ اگر سلامت بھی رہا تو بوجھ سڑک پر پٹکنے کی سزا سے جسم تو کیا روح بھی کانپ اٹھتی۔ ان کوڑوں سے وہ قہقہے زناڑے دار تھے جو اس کی ٹوپی کے گرنے پر لگائے جاتے۔ پیڑھی در پیڑھی دستاریں حقارت سے اتار کر بوجھ اٹھانے والوں کے گلے میں ڈال کر ان کی انا کو پھانسی دی گئی۔ بردہ فروشی کی ایک ایسی دستاویز ان کے ماتھے پر چسپان کر دی گئی کہ قسمت کی لکیریں اندھی ہو گئیں۔

اور جب مہاراجا کا سپاہی کسی گاؤں میں دندناتا ہوا داخل ہوا تو غلاموں کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا ہوئی۔ اس سنسناہٹ سے ٹولے پڑے جسموں میں سلسلاہٹ جاگ اٹھی۔ ہڈیاں تھر تھرانے لگیں کہ ان میں اب کوڑوں کی ضرب برداشت کرنے کا یارا

نہیں۔۔۔ پھر سپاہی کے نتھنے پھڑ پھڑائے:

”حرام خور! مہارانی کے خواب میں مچھلی آئی ہے۔ اس مقدس مچھلی نے مہارانی سے شکایت کی ہے کہ اس گاؤں کے لوگ ندی میں مچھلیوں کا شکار کرتے ہیں۔ تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ راج جیوتشی نے کہا تھا کہ سورگیہ مہاراج کی آتما ایک مچھلی میں پرویش کر رہی ہے۔“

پھر اس شخص کو ابلتے تیل کی کڑھائی میں ڈالا گیا جس کے گھر سے مچھلی کے شکار کرنے کا ہتھیار بیچ شاخہ برآمد ہوا۔ اس کی جلی بھنی لاش جب عبرت کے واسطے کھبے سے لٹکائی گئی تو چیل، کوئے اور گدھ غول درغول امنڈ آئے۔ کئی دنوں تک ڈر کے مارے مظلوموں نے گھڑوں سے پانی نہ نکالا۔

اگرچہ بیس کوس تک کوئی ندی نہیں تھی پھر بھی غلام سوچ میں یہی آیا کہ مہارانی کا خواب جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اپنی سزا کو جائز سمجھنے لگے۔ بیگار کے خوف سے بیسیوں نے حمل کرنے کی بددعائیں مانگیں کہ جو ان بیٹے کی لاش پر سینہ کوٹنے سے اپنی کوکھ پیٹ پیٹ کر بیچ ناس کرنے میں بھلائی ہے۔

ہڈیوں کا ڈھانچہ اپنے ننگے بھوکے ٹبر کو ایک نظر دیکھ رہا ہے اور ایک نظر کھلیان میں اناج کے ڈھیر کو۔ آنکھ برابر ٹوکری اس ماں کے سر پر ہانڈی پکنے کا خواب دیکھ رہی ہے جس پر بھری بہار میں برف گری ہے۔ جاگیر دار کے اہلکاروں کے جوتوں کی چمراہٹ سن کر ہڈیوں کا ڈھانچہ کھیت میں پرندوں کو ڈرانے والا بجوکا بن گیا۔ بجوکا دیکھتا ہی رہا اور کھلیان میں مڑیاں اتر کے جھاڑ پھیر گئیں۔ آنکھ بھر ٹوکری، ساون بھر آنسو اور آسمان بھر بھوک۔ پاؤں میں پگڑ گراتو خون پسینہ بہانے والے کوٹھی بھر بھیک اور کائنات بھر گالیاں ملیں۔

مہارتھیوں کی سستی سادریوں پر بھولے سے بھی کوئی ”ملیچھ“ نظر پڑتی تو آنکھوں میں دہکتی سلاخیاں پھیر لی جاتیں۔ یہ بوڑھے گرگ مہاراجا کی چیلوں کو زندہ انسانوں کے جسم کو نوچنے کا ہنر سکھاتے کہ ان کے اقبال کا سورج ڈوب کے ”ملیچھوں“ کی ہتھیلی میں اگا تھا۔ ایک ایسی ہتھیلی جس نے پھیل کر مہارتھیوں کو صدیوں تک آسمان برابر آشیر واد دیا۔ وقت نے کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف پھیر لیا تو ابھرتے سورج کی پوجا کرنے والے کلسے بھر بھر کے افق کو ارپن کرنے لگے۔ اور کل تک جن کے سر پر تاج تھا پھر ان کی دستاریں پوٹڑے بن گئیں۔

مینار کا سایا جب کلس پر پڑا تو مہاراجا کو لگا کہ دھرم برشت ہوا۔ مہارانی کو اس سائے پر سانپ کا وہم ہوا۔ پانچ وقت جب سانپ پھنکارا تو مہارانی کے دل میں زہر پھیلنے لگا۔ ادھر مہم ہی ادھر مہم۔

پھر ایک تیر سے تین چھید کیے گئے۔ تیزاب کی بوتل سے ایک اور جن نکلا:
 ”جو حکم آقا۔“

”ملیچھوں کے دماغ میں کیڑے ڈالنے کا کوئی سرل اپائے بیان کرو۔“
 ”آقا ان کی عصمتوں کو کوٹھوں پر بٹھانے سے بڑھ کر کوئی اپائے نہیں۔“
 ”مگر اس میں ہمارا کیا فائدہ؟“

”آقا کیا یہ کافی نہیں کہ یہ ”ملیچھ“ غیرت سے دن میں سو بار مرجائیں؟ کوئی تیر نہیں، کوئی گولی نہیں، کوئی تلوار نہیں اور دشمن مرغِ بسمل کی طرح پاؤں پیٹنے لگے۔ بازارِ حسن کے چرچے سن کر سیلانی ٹوٹ پڑیں گے۔ جتنے سیلانی آئیں گے اتنے شاہی خزانے کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اور رنڈیوں پر محصول مقرر ہو تو آپ کے تاج میں روز نئے

لعل بدخشاں لگ جائیں گے۔“

پھر مہاراجا کے حکم سے بازارِ حسن کھولا گیا اور قصائیوں نے کچی جوانیوں کو کانٹوں پر لٹکا کر گچھا گچھا بغدادے مارنا شروع کیے۔ پھر جب کوٹھے کی سیڑھی سے بوڑھی اماں کو نیچے دھکیلا گیا تو مہاراجہ کے اہلکار اس کی ڈھنڈیا میں نکلے۔ اماں ہانپتے ہانپتے تھک گئی۔ اور مٹی کے ڈھیر کی طرح راستے میں پڑی رہی۔ سپاہی غرایا:

”کیوں بڑھیا! محصول تمہارا باپ ادا کرے گا۔“

پھر اماں بھیک مانگ مانگ کر محصول ادا کرنے لگی۔ اور جاڑے کی ایک سردرات نے اس کو برف کا کفن پہنایا اور وہ روئی کے گالے کی طرح آسمانوں میں اڑنے لگی۔ رات کے سینے میں جگنو برابر دھڑکن جاگ گئی۔ تارے آہٹ سن کر آنکھیں موندنے لگے:

”کون ہے یہ جو خون کے قتل دریا میں سینے تک ڈوبا ہوا کاغذ کے چراغوں کو بہا رہا ہے؟ اسے خبر نہیں کہ دیے جلانے کا حق صرف گھنٹیاں بجانے والوں اور مرگِ انبوہ پر جشن منانے والوں کو ہی حاصل ہے۔“

”یہ مینار پر کھڑا ہو کر کون پھنکار رہا ہے؟ اسے معلوم نہیں کہ کدالوں سے دریائے خون کے پستے توڑنے والے لٹل کے چبوتروں سے دیکھ رہے ہیں۔“

”یہ کون مینار سے گر گیا؟ رک جاؤ اس کے سینے میں خون کا درہ کھول دیا گیا ہے۔ آگے مت بڑھو۔“

”نہیں آگے بڑھو مینار پر ڈٹے رہو۔۔۔ لاشوں پر کفن ڈالنے کے لئے اپنی دستاریں پیش کرو۔“

یہ سن کر کئی بیسیوں نے سر سے اوڑھنیاں اتاریں۔ پھر کچھ سوچ کر ان اوڑھنیوں

کو اپنے پاؤں تلے روندنا:

”آبرو باختہ بندھیوں کی اوڑھنیوں سے مقدس خون کی بے حرمتی نہیں ہو سکتی۔“

اور آسمان پر مقدس روحمیں بین کرنے لگیں۔ پھر وہ مینہ برسا کہ سڑکوں پر گرے ہوئے گرم خون سے ندی کی مانگ چمک اٹھی۔ اور بابل کے گھر سے کتنی ڈولیاں اٹھ گئیں۔ پھر مہارانی ایک بھیانک خواب سے چونک کر جاگ اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ مینا رساں کی طرح ریگلتا ہوا آیا اور پھنکارتے ہوئے کلس پر اپنی کنڈلی کس لی۔ مہارانی کو لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ زوید راج جیوتی نے اپنی گھنی مونچھوں کے سائے میں ہونٹ ہلائے:

”ادھر، ادھر، وناش، وناش، اوم شانتی اوم۔“

”اپائے؟“ مہارانی نے اپنا آنچل اس کے آگے پسار کر پوچھا۔

”ادھر میوں کا سروناش۔“

جیسے پھٹی ہوئی دھونکنی سے جھو جھری آواز نکلی۔

پھر اندھیری راتوں میں سازشوں کا جال یوں بنا گیا کہ بھوؤں کو آنکھوں کے جھپکنے کی خبر نہ ہوئی۔ رات کی خاموش فضا میں جب معصوم آنکھیں حسین خواب دیکھ رہی تھیں دھرم رکھشکوں کے لئے سرحدیں کھول دی گئیں۔ فوجی چھاؤنیاں اٹاٹا بھر گئیں۔ پھر دھرم دیدہ کا آرمبھ ہوا۔



تپسوی

اگنی کی طرح ایک پوتر آتما



ایک آتما بن بن مٹھی بھر راکھ بھسوت کے لئے گیوں سے بھٹکتی ہے کہ تن کو شانت کرنے کا یہی اپائے بتایا گیا۔ اس نے پیڑ سے ڈالی مانگی تو پیڑ نے پوچھا:
 ”بھکشو ہو؟“ اسے جھر جھری آئی۔

ندی کا پانی بخ کی چادر اوڑھے کسی اور ہی یگ کا سپنا دیکھ رہا تھا۔ اس نے بخ کو توڑنا چاہا تو بخ چیخ پڑا:

”اے نادان! تو جس چیز سے مجھ پر ضرب مار رہا ہے وہ انسان کی ہڈی ہے۔“

وہ کانپ اٹھا:

”کون ہوں میں؟“

اس کی انترا آتما بولی:

”تم بالک ہو بالک۔ اس پر کرتی کے بالک۔“

اس نے شیتل گھاس پر پاؤں رکھا تو شبنم کا شیش محل تڑخنے لگا:

”او بالک دیکھ۔ آکاش پر چرخہ کاتنے والی بوڑھی اماں کا گریبان مسکتے مسکتے

پھٹ گیا ہے۔“

اسے لگا کہ اماں کے گریبان سے سینہ جھانک رہا ہے۔ اس نے غیرت سے اپنی پگڑی اتار کر چاند کو ڈھک دیا۔

پھر اسے ایک صداسنائی دی:

”ہوشیار خبردار مہاراجوں کے مہاراجا پدار رہے ہیں۔“

وہ دبدہا میں پڑ گیا:

”مگر اس محل میں تو سناٹا ہے۔۔۔ یہ آواز کہاں سے آئی؟“

بھوک بلاس کی نگری نے محل کو ایک ویرانے کی طرف کھدیڑا۔ قلعہ کی دیواروں پر جگہ جگہ پر سے کی کا لک لگ گئی۔ محل کی دیواروں پر لٹکنے والی رعب دار تصویروں کی جگہ اکھڑی ہوئی کیلیں لرز رہی ہیں:

”اس ڈراؤنے کونے میں یہ پراچین بت ہے یا کوئی تپسوی؟ اس جھٹاداری سادھو کی ڈاڑھی ناف کو چھو رہی ہے۔ تن پر بھبھوت کے سوا کچھ نہیں۔ اگنی کنڈ میں راگہ سورہی ہے۔ جیسے کوئی آتما جنم جنم بھٹکنے کے بعد شانت ہو گئی ہے۔“

اس نے مٹھی بھر راگہ کے لئے جو ہاتھ بڑھایا تو راگہ اڑ کے تپسوی کی پلکوں پر بیٹھ گئی:

”اے اگنی کی طرح پوتر آتما! کون ہو تم؟“

آتما نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اسے لگا کہ ان پلکوں پر کئی یگ انڈرائی لے رہے ہیں۔ اس نے اپنے یگ کو پہچانا۔

مہاراجا شکار کے بعد ایک ندی کے گھاٹ پر اترا۔ یہ دیکھ کے اچنبھت ہوا کہ

گھاٹ پر شیر اور ہرن ایک ساتھ پانی پی رہے ہیں:

”اس جگہ ایک نگر بسایا جائے۔“ مہاراجا نے آدیش دیا۔

پھر پلکیں لرزنے لگیں اور وہ یگ جاگ گیا جب ندی کے گھاٹ پر شیر ہرن کی
پسیلوں کو چاٹنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس نے تپسوی کے چرنوں میں سر ڈال کر آنکھیں موند لیں۔
دور افق پر کسی اور یگ کا سورج اگ رہا تھا۔



مائیں

پیٹ سے نکالے ہوئے لوہڑے نالیوں میں بہائے گئے۔



کئی دن راج دھانی میں گھنے گاڑھے دھویں کی وجہ سے سورج نہیں نکلا۔ لوگ باگ گھروں میں ہی رہے مبادا اندھیرے میں کسی لاش سے پاؤں ٹکرائے اور ٹھوکر لگی تو دھرم بھر شٹ ہوگا۔ پھر بموجب حکم مہاراجا دربارِ خاص میں شہر کی صورتِ حال سے واقف کرانے کی غرض سے خاص درباریوں اور امراء کو طلب کیا گیا۔ پس جب درباری اپنی اپنی نشستوں پر متمکن ہوئے تو مہاراجا اور مہارانی دونوں کو خبر کی گئی۔

اس سے قبل کہ چوب دار ادھم سنگھ کو مہاراجا اور مہارانی کے روبرو حاضر ہونے کے لئے پکارتا مہارانی نے تاکید کروائی کہ ادھم سنگھ کے بیان کے وقت جملہ حاضرین ہمہ تن گوش ہوں کہ ایک لفظ بھی دہرانا نہ پڑے۔ ایک تو محل میں شادمانی کا ماحول تھا اس پر چوب دار طبیعت سے ظریف تھا، چنانچہ اس نے کچھ زیادہ ہی مبالغہ کیا:

”بادب، باملاحظہ، ہوشیار۔ شہریاروں کے شہریار، مہاراجا بلند اقبال مہارانی خورشید مثال دربار کی رونق بڑھانے کے لئے تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ تمام حاضرین باہمکین کو تاکید کی جاتی ہے کہ ادھم سنگھ کی دُر افشانی میں کوئی صدا مخل نہ ہو۔ محل کے چبوتروں پر نیزہ بردار باگڑ بلوں کی مانند مامور کیے گئے ہیں مبادا کوئی صدا اے پرند زینتِ دربار کی

سماعتِ پُر لطافت میں خلل پذیر نہ ہو۔ انتباہ ہے کہ ادھم سنگھ کے بیان کے دوران اگر کسی نے لب کشائی تو دور جمائی لینے کی بھی حماقت کی تو اس کے منہ میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے گا۔ اور سانچے سے منہ کے جوڈھانچہ برآمد ہوگا عبرت کے واسطے مفرد ہوگا۔ نیز وہ جو ہانپنے اور دھسک کی وجہ سے حکمِ ہذا کی عمل آوری سے معذور ہوں، فی الفور دور ہوں۔“

حاضرین یہ نظریفانہ کلام سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

بارے جب مہاراجا اور مہارانی اپنے اپنے تخت پر براجمان ہو گئے تو اشارہ پا کر چوب دار پکارا:

”کمان داروں کے کمان دار، تلوار برداروں کے سردار، ادھم سنگھ مہاراجہ اور مہارانی کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں۔“

ادھم سنگھ حاضر ہوا تو پہلے مہاراجا کے نکت پینچا۔ اول اس کے پاؤں چھو کے آشیردار لیا پھر نیام سے تلوار کھینچ کر مہارانی کے پاؤں پر رکھ دی۔ تلوار کی دھار جو نیام کے سینے سے ٹکرائی تو سن کی آواز سن کر مہارانی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مہاراجا بولا:

”ادھم سنگھ تمہارے جوتوں کی چمراہٹ میں زہریلے سانپوں کی پھنکار ہے۔ تمہاری تلوار پر لگے ہوئے خون کے دھبوں کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے درندہ اپنے شکار کی بوٹی بوٹی چبا کر اس کی پسلیوں پر اپنی خون آلودہ باجھیں پونچھ رہا ہے۔ تمہاری چیل جیسی آنکھوں میں مجھے خون کا وہ لوٹھڑا نظر آتا ہے جو چنگیز خان اپنی ماں کی کوکھ سے مٹھی میں لے کر آیا تھا۔ بیان کر شہر کا حال بیان کر۔ اور جو ہمارے گوش گزار ہوا ہے اس سے آگے کا دھیان کر۔“

یہ سن کر ادھم سنگھ تعظیم سے دوہرا ہو گیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا:

”مہاراج کا اقبال بلند ہو۔ یہ ادھم سنگھ ہیمچندراں احوالِ خونچکاں یوں بیان کرتا

ہے کہ شہر کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں گدھ ”بھونک“ رہے ہیں۔ چیلیس ”چنگھاڑ“ رہی ہیں،
 کوٹے ”غرار ہے“ ہیں۔“

مہاراجا نے اچنتی نظروں سے درباریوں کی طرف دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے
 سے ادھم کو روکا۔ پوچھا:

”اور کتے؟“

ادھم سنگھ مہاراجا کے اس ناگہانی سوال پر مسکرایا۔ بولا:
 ”اور کتے اس شہر کے ”ادھر میوں“ کی لاشیں کھا کھا کے سیر ہو چکے ہیں۔
 گاؤں کیوں کی طرح ڈھیر ہو چکے ہیں۔ پیٹ ان کے دیکھ کے لگتا ہے جیسے حمل بردار ہوں۔“
 یہ سن کر مہارانی کی باچھیں کھل گئیں۔ ادھم کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا:
 ”اور کتیاں؟ کتوں کا بھی کچھ حال بیان کر ادھم۔“

مہارانی کے اس سوال پر حاضرین نے مشکل سے ہنسی روکی۔ ادھم کتوں کی
 کیفیت بیان کرنے لگا:

”رانی ماما! کتیاں گرسہ اس شہر کی بسیار خوری سے اپنا حمل گرا چکیں اور پلے
 نالیوں اور موریوں میں سڑپ سڑپ جے ہوئے خون کے لوتھڑے چاٹ رہے ہیں۔ کچھ
 کتیاں بیچ سڑک کے، کچھ پرچھتیوں کے نیچے کچھ دکانوں کے تھڑوں تلے ناگئیں پھیلائے
 سکھ شانتی سے سو رہی ہیں۔ کچھ بے نیازی سے ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ البتہ جنگلوں اور
 بیابانوں سے سیار اور بھیڑیے گھس پیٹھ کر کے رات بھر ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جاتے
 ہیں۔ صبح پولیس اہلکار انہیں کھدیڑتے ہیں تب پجاری طممن ہو کر مندروں میں گھنٹیاں
 بجاتے ہیں۔“

ادھم سنگھ کی سانس پھولنے لگی۔ وہ اپنی باجھوں کا کف صاف کرنے لگا کہ مہاراجا

نے پوچھا:

”ادھم سنگھ تمہاری سانسوں کے تار میں مہاراجا موتی پروئے گا۔ یہ بتا کہ دیہات

کا حال کیا ہے؟“

ادھم سنگھ نے ذرا سا توقف کیا۔ بولا:

”مہاراج کے دل کو تسکین ہو دیہات کا نقشہ اس سے مختلف نہیں۔ شہر رگ پر شہ

رگ کٹ رہی ہے۔ ادھر میوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ یہ تلوار جو رانی ماتا کے پائے مبارک

میں پڑی ہے، کتنے سینوں میں گڑی ہے۔ اس کی آنکھ کو جو ”ادھرمی“ نظر آیا، پھر لوٹ کے نہ

اپنے گھر آیا۔ الغرض جس ”ادھرمی“ کو دیکھا اس کی گردن کا ختنہ کر ڈالا۔ شہر رگوں سے

اچھلتے ہوئے خون کے فواروں سے چھاتیوں پر پھیلی ہوئی ڈاڑھیاں لت پت ہو گئیں۔

نرخروں سے اچھلتے ہوئے غرغرغرغون کے غراروں کی آوازیں سن کر گھوڑے سپاہیوں کے

بدکنے لگے۔“

مہاراجا کچھ دیر سردھنٹا رہا۔ پھر ایک نظر دیوار پر لگے اپنے پرکھوں کی تصویروں

پر ڈالی۔ مونچھوں پر تاؤ دے کر ادھم سنگھ کی طرف متوجہ ہوا۔ ادھم سنگھ سمجھ گیا کہ مہاراجا اس

داستان ظلم کا ہر ورق پلٹنا چاہتا ہے۔ بولا:

”جو سرمصلے پر جھک جھک کر پیشانی کو داغدار کر گیا تھا اس پر تلوار گرا دی گئی۔

کھوپڑیاں ادھر میوں کی یوں چر مراٹھیں جیسے جھو جھرے بانس ایک دوسرے پر گر رہے

ہوں۔“

مہارانی نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا:

”ادھم سنگھ! کچھ حال اس ذات کی عورتوں کا بھی بیان کر۔“

ادھم سنگھ نے مہارانی کی طرف دیکھ کر گردن اپنی جھکائی۔ بولا:

”رانی ماتا خاطر جمع رکھیں۔ ماؤں کے پیٹ چاک کیے گئے۔ لوتھرے جو کہ ان سے نکلے نالیوں میں بہا دئے گئے۔ ریشم سے نازک مسوڑوں سے چوچیاں ماؤں کی کھینچ کر نکالی گئیں۔ دودھ پلانے والے پستان کاٹنے سے پہلے روٹی کے گالے جیسے پتوں کو نیزوں کی زینت بنادیا گیا۔ کچھ پستان اب بھی گلیوں میں لٹک رہے ہیں۔ جس کو کھ میں اس ذات کی آنے والی نسلوں کے بیج پڑتے اسے ”دھرم رکھشکوں“ نے تیزاب چھڑک کر ہمیشہ کے لئے بنجر بنادیا۔ کنویں اور تالاب زرناریوں کی لاشوں سے بھر دئے گئے۔“

یہ سن کر مہاراجا نے وحشی قہقہہ لگایا۔ اسے لگا جیسے قلعہ الموت پر قہر ڈھانے کے بعد ہلاکو خان شب ب سری کے لئے خیمے میں داخل ہوا جس میں ایک سو برہنہ عورتیں قطار در قطار لیٹی ہوئی ہیں۔ ہلاکو خان جھومتا ہوا ان کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ لڑکھڑاہٹ میں اس کا پاؤں کسی عورت کے سینے یا کسی اور جگہ پر پڑا۔ عورت کی چیخ سن کر اس کے منہ سے ٹہکا نکلا۔ وہ مستی میں قطار در قطار گھوم رہا ہے۔ اب وہ تھک کر کسی عورت پر گر گیا اور اس عورت کے منہ سے ایک دردناک سسکاری نکلی۔

صبح دن چڑھے ایرانی موسیقی کی مدھرتانوں سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خیمے سے نکل کر اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا:

”اس سے بڑھ کر تمہارے مہاراجا کے لئے خوشی اور شادمانی کی کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہمارے دشمنوں کا سروناش ہو رہا ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں اور ہمارے سپاہی ان کی ہر چیز پر قابض ہو رہے ہیں۔ ان کے داروٹوں کے بین سے بڑھ کر کوئی

راگنی سریلی نہیں۔ ادھر میوں کے گھوڑے ہمارے سپاہیوں کی ران کے نیچے ہیں اور وہ ان کی حسین عورتوں کو اپنے خیموں کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہے ہیں۔ میں ان سیوکوں کو آشیر واد دیتا ہوں جو اپنی آغوش ان عورتوں کے جسم سے گرم کر رہے ہیں۔“

پھر تاریخ کے جھروکے سے ایک آنکھ یہ دیکھ کر رونے لگی کہ خیموں میں حوا کی بیٹیوں کے ساتھ ایسی شرم ناک حرکتیں کی جا رہی ہیں کہ شرم بھی آنکھ موند کر سینہ پیٹ رہی ہے۔ ایک درد انگیز اور الم ناک شام ڈھل گئی تو شہر میں سیار بولنے لگے۔ رات بھر شہر میں ایسی آوازیں آرہی تھیں جن میں وحشت بھی تھی اور دردناکی بھی۔ ایسی آوازیں جنہیں سن کے زمین کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔

جیسے لکڑ بھگے لاشوں کے بٹوارے پر آپس میں لڑ رہے ہوں۔



سندور

گلاب کی پتی خون اُگل کے مرگنی

راگنی سریلی نہیں۔ ادھر میوں کے گھوڑے ہمارے سپاہیوں کی ران کے نیچے ہیں اور وہ ان کی حسین عورتوں کو اپنے خیموں کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہے ہیں۔ میں ان سیوکوں کو آشیر واد دیتا ہوں جو اپنی آغوش ان عورتوں کے جسم سے گرم کر رہے ہیں۔“

پھر تاریخ کے جھروکے سے ایک آنکھ یہ دیکھ کر رونے لگی کہ خیموں میں حوا کی بیٹیوں کے ساتھ ایسی شرم ناک حرکتیں کی جا رہی ہیں کہ شرم بھی آنکھ موند کر سینہ پیٹ رہی ہے۔ ایک درد انگیز اور الم ناک شام ڈھل گئی تو شہر میں سیار بولنے لگے۔ رات بھر شہر میں ایسی آوازیں آرہی تھیں جن میں وحشت بھی تھی اور دردناکی بھی۔ ایسی آوازیں جنہیں سن کے زمین کا کلیجہ پھٹ رہا تھا۔

جیسے لکڑ بھگے لاشوں کے بنوارے پر آپس میں لڑ رہے ہوں۔



سندور

گلاب کی پتی خون اُگل کے مر گئی



ایک ندی — شہر کی مانگ میں سندور، پیشانی پر حلقہ نور۔ پانی جس کا
 گلے میں گنگا جل اور اوک میں زمزم۔ مقدس روح نے پہاڑ کے سینے میں پر اسرار کھڑکی
 کھولی اور سوئی ہوئی برف کو سانس لینا سکھایا۔ آسمانی بزرگ نے نورانی لفظوں کی تسبیح
 پہنائی۔ پھر جو چاند نے مٹی کے برتن میں آنکھیں موندتے موندتے جھانکا تو آرسی ترخ
 گئی، تاروں کی نیند چمک اٹھی۔ پگھٹ پر خواب جو اپنی ہی پازیب کی جھنکار سے چونکا تو
 ریشمی آسمان میں ابر نیسان کا دل دھڑک اٹھا۔ آنکھ دھوپ نے کھولی اور انگڑائی چنار نے
 لی۔ پھر شاخوں سے پرندے آک کی بڑھیا کی طرح اڑنے لگے۔ اور جب کنواری مٹی پر
 پانی نے مہندی لگائی تو خوشبو کی آنکھ کھل گئی۔ پھر تھل تھل چلنے والی ہوا کے پاؤں سے لپٹ کر
 آنگن میں رنگولی بنائی۔

اور پھر ایک سفاک رات ایسی پڑی کہ کسی خوف زدہ آواز سے بوڑھے چنار کی
 جھریوں نے انگڑائی لی:

”جلال الدین! جلال الدین! یہ آسمان پر کوئی شعلہ لپکا جس کا عکس دریا میں
 لرزتے ہوئے دھڑکا، یا چڑیلوں نے ہمیں ڈرانے کے لئے پانی میں مردوں کی ہڈیوں کا

سفوف جلا یا؟“

گلناز بی بی نے اپنے شوہر جلال الدین کا شانہ جھنجھوڑ کر پوچھا۔ جلال الدین نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے سینے میں دھڑکن چبھنے لگی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جو اگر ازل سے پہلے طلوع ہونے والی صبح کو دکھائی دیتا تو خوف سے مرجاتی۔ ایسا لگتا تھا جیسے رات کائنات کی ناگہانی موت پر بال کھولے ماتم کر رہی ہو۔ پچھلپائیوں کی گردنیں مڑ گئی تھیں۔ ان کے پستان قصائی کے کانٹے سے ٹنگے ہوئی اوجھڑی کی طرح لٹک رہے تھے۔

جلال الدین کے جسم میں سنسناہٹ دوڑی۔ بولا:

”ارے بگلی! دریا کہاں ہے؟ اور آسمان کدھر؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ یا تو کسی نے میری پتلیوں پر کالی کیچڑ پوت دی ہے یا پوری کائنات سیاہ قبر میں دفن ہو گئی۔ تم جسے آسمان کہہ رہی ہو یہ اندھیری کھائی ہے جو کالی آنکھوں سے اندھا خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ دریا نہیں سیاہ لکیر ہے۔ لہروں کی چھپ چھپ میں خون کی دوشیزگی اور معصومیت کا نوحہ ہے۔ چاند کا حمل گر گیا اور چاندنی ماتمی چھٹولا پہن کے سو رہی ہے۔ تاروں کی آنکھوں میں چچک کے آبلے پھوٹ رہے ہیں۔ گلناز! رات کی کوکھ سے شیطان پیدا ہوا اور اس کی آنول نال سے ٹپکتے ہوئے تیزاب کے کالے قطرے زمین کی کنواری کوکھ کو بانجھ بنا رہے ہیں۔ میری تسبیح کا دھاگا ٹوٹ گیا۔ دانے بکھر گئے۔ زمیں پر ٹٹولتے ٹٹولتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ سوچتا ہوں میرا وجود خود ایک کالے کاغذ پر کالے دھبے کی طرح موہوم سانس لے رہا ہے، بھلا مجھے دانے کہاں سے ملیں گے۔“

گلناز بی بی پر ہیبت طاری ہو گئی۔ وہ لڑ براتی ہوئی بولی:

”جلال الدین! ہوش میں آؤ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ میرے دل میں ہول اٹھ رہا ہے۔“

جلال الدین کی آنکھ میں جیسے سنسنا تا ہوا تیر لگا۔ رندھے ہوئے لہجے میں بولا:

”ایک سو ستر برس پہلے مجھے ہوش آیا تھا۔ دس برس کا تھا میں تب۔ ایسی تاریکی کبھی دیکھی نہ سنی۔ گلناز! تمہیں معلوم نہیں کیا؟ اس شہر کے کتے بے خوابی کا کوڑھ چاٹ رہے ہیں۔ وہ دور جہاں ندی موڑ کاٹتی ہے، تم نے دیکھا نہیں وہاں کتنی انسانی کھوپڑیاں جمع ہو گئی ہیں؟ ان کی کھلی آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے جیسے کسی خواب کا کوئی حصہ باقی رہ گیا ہے۔ کوئی خواب، کوئی خوف، کوئی دہشت، کوئی حسرت، کوئی امید۔۔۔ کچھ تو ہے جو، اب بھی ان آنکھوں میں موجود ہے۔ کسی سر کا سندور دیکھ کے لگتا ہے جیسے گلاب کی پتی خون اگل کے مر گئی۔ کسی کی پیشانی کا تشقہ دیکھ کے لگتا ہے جیسے نیند میں سبکیاں لیتے ہوئے بچے کے گال پر آنسو سوکھ گیا۔ بالکوں کے سر دیکھ کے لگتا ہے جیسے ماؤں نے ابھی ابھی اپنے لاڑلوں کی مانگ نکالی۔“

جلال الدین دھاڑیں مار کے رونے لگا۔ گلناز بی بی نے اس کا سراپنی گود میں لیا۔ اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ کر بولی:

”سو جاؤ، سو جاؤ جلال الدین کہ رات بھیگ چکی ہے اور خدائی سو گئی ہے۔“

جلال الدین نے چونک کر مجذوب کی طرح بڑبڑاتے ہوئے کہا:

”سچ کہتی ہو گلناز! خدائی سو گئی ہے۔ خدائی سو گئی ہے۔ ورنہ مندر کی گھنٹی کی زنجیر

سے ”اللہ اکبر“ کو لٹکا کر پھانسی نہیں دی جاتی۔ ”اوم شانتی اوم“ کہنے والے کا گلا تسبیح سے نہ گھونٹا جاتا۔ گرنتھ صاحب کے اشلوکوں کو پگڑی کا کفن نہ پہنایا جاتا۔ جو بی بی تاروں کی

چھاؤں میں بھی پردہ کرتی تھی اس کے ازار بند کی گانٹھ نہ کھولی جاتی۔ جو ساوتری بھگوان کی مورتی کے آگے بھی گھونگھٹ کاڑتی تھی اس کی ساڑی کو خون میں لتھڑے ہوئے جوتوں سے پامال نہ کیا جاتا۔ جس سینے میں ”واہے گرد“ بولنے والوں کی غیرت کا شیر ابل رہا تھا اس کی محرم بندوق کی نال پر نہ لٹکائی جاتی۔ اے مخلوق کے پرودگار! تیرا شکر کہ تو نے ہمیں آدم زاد سے پیدا نہ کیا۔ ہم جنات تیری دنیا کے نقشے پر خون سے لکیریں نہیں کھینچتے۔“

دور کسی خواب کے سینے میں خنجر بھونکنے والے کا وحشی تہقہہ گونجنے لگا۔ اور جلال الدین ہول کے مارے خاموش ہو گیا۔



حسان محمد ملک

گھر کی عصمتیں کفن سے ڈھانپنے والا مظلوم



”اُمّی جی!“

کلو نے کترے ہوئے پیاز کی تھالی ایک طرف سرکائی اور آستین سے آنسو پونچھ کر چلایا۔ جب وہ اس کے آگے کچھ نہ بولا تو جان محمد ملک کی بیگم عائشہ بی بی نے ٹوکا:

”یہ ناک سڑکنا بند کر جو کہنا ہے وہ کہہ کے پھوٹ ملک صاحب دو دفعہ پکار چکے ہیں۔“

کلو نے چوکے کا مونڈھا عائشہ بی بی کی طرف سرکا کر انہیں اس پر بٹھایا۔ بولا:

”اُمّی! آپ کو مصلے سے اور ابو جان کو تپپوان سے آگے کچھ بھائی دکھائی بھی دیتا ہے کہ نہیں؟ دنیا جہان کا کیا حال ہے کچھ خبر بھی ہے کہ نہیں؟“

عائشہ بیگم نے ڈانٹ کر کہا:

”کیا بک رہا ہے نامراد!“

کلو نے آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔

”بک نہیں رہا ہوں اُمّی جی!“

عائشہ بیگم نے جل بن کر کہا:

”ارے بولتا کیوں نہیں۔ کیا ہوا دنیا جہان کو؟ سب کچھ تو ٹھیک ٹھاک چل رہا

”ہے۔“

”خاک ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔“

اس نے جھلاتے ہوئے کہا:

”ملک میں آگ لگی ہے اور آپ کو سب کچھ ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہا ہے۔“

یہ سن کر عائشہ بی بی گھبرا گئیں۔ اڑتی سی خبر انہوں نے بھی حالات کی خرابی کے بارے میں سنی تھی۔ انہیں تشویش ہونے لگی:

”ہائے اللہ! کلو صحیح صحیح بول۔“

”کلو! کہاں مر گیا تو۔“

جان محمد نے پکارا۔ کلو چوکے سے بنا کچھ کہے نکل گیا۔ وہ ہڑبڑاہٹ میں

سیڑھیاں اترنے لگا:

”آیا ابو جان۔“

جان محمد ملک اپنے صحن میں کھاٹ پر کنڈلی مارے لیٹے تھے۔ کلو کو دیکھ کر بھڑک

اٹھے:

”کیوں بھی کلو کے بچے! کانوں میں روئی ٹھونس کے رکھی ہے؟ دیکھتا نہیں کہ چلم

سرد ہو گئی ہے۔“

کلو نے خاموشی سے چلم اٹھائی اور انگلی ٹھسی سے چن چن کر انگارے اٹھانے لگا۔

ملک صاحب نے آواز دی:

”راکھ اچھی طرح اڑانا۔ اور انگاروں کو پھونک مار مار کے وہیں دھکانا۔ کل ایک

چنگاری اٹھ کے شال میں سوراخ کر گئی۔“

”انہیں شال کے سوراخ کی پڑی ہے۔ ایک چھوٹی سی چنگاری دکھائی دے رہی ہے مگر جو بستیوں سے شعلے اٹھ رہے ہیں ان کی طرف نظر نہیں اٹھتی۔“

کلو بڑبڑانے لگا تو ملک صاحب نے غصے سے کہا:

”کیا بڑبڑا رہا ہے بے؟ جلدی کر۔“

چلم ٹیروے پردھر کے کلو جانے ہی والا تھا کہ ملک صاحب نے آواز دی:

”کلو ادھر آ ذرا۔“

کلو چار ہائی کا پایہ پکڑ کر بیٹھا:

”کیا بتا رہے تھے ملک کے حالات کے بارے میں تم؟“

ملک صاحب نے پوچھا۔ کلو نے معصومیت سے کہا:

”کون کہہ رہا تھا ابو جان!“

ملک صاحب نے ڈپٹ کر کہا:

”ابے ابو جان کے بچے! ابھی تو اتنی جان سے اپنی کیا کہہ رہا تھا۔ وہی پوچھ رہا

ہوں۔“

کلو نے بنتے ہوئے کہا:

”ابو جان! میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ چلم میں جب انگاروں پر راکھ جمتی ہے تو پتہ ہی

نہیں چلتا کہ راکھ کے نیچے کہاں انگارہ ابھی دکھتا ہے۔“

ملک نے غصے میں پوچھا:

”ابے جو پوچھ رہا ہوں اس کا صحیح صحیح جواب دے۔“

”ابو جان!“

اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا:

”آپ کھاٹ پکڑ کر یہاں دن بھر لیٹے رہتے ہیں۔ ادھر ادھر کی کچھ خبر بھی ہے؟ ملک کے حالات سخت خراب ہیں۔ سنتے ہیں گاؤں گاؤں گھات پڑ رہی ہے۔ لوگ گاجر مولیٰ کی طرح کٹ رہے ہیں۔“

”اچھا؟“

ملک صاحب کے لہجے میں تعجب سے زیادہ خوف تھا:

”اور نہیں تو کیا۔“

کلو نے اپنا بیان جاری رکھا:

”ابھی بازار میں قادر پہلوان کا بیٹا صمد کا ٹملا۔ مجھے ابے تے بول کے آواز دی۔ میں غصے کی آگ میں بھنٹا ہوا جو اس بھوتنی کے پاس گیا تو کہنے لگا: ”ابے کلو اتو کس بات پر اکڑتا ہے؟ سالے اپنے ابو جان سے کہنا کہ میری ممتاز محل کو سجا کے رکھے۔ میں بارات لے کر جلد ہی آجاؤں گا۔“ میں نے سالے کا گریبان پکڑ کے ایک آنکھ دبا کر کہا: ”کانے سالے! تو ارمان میں ہی رہے گا اور ارمان لے کر ہی مرے گا۔ بے غیرت! میری ممتاز دیدی تو شہزادی ہے شہزادی۔ کوئی شہزادہ ہی اس کی بارات لے کر آئے گا۔ کینے تو اس دن آنا ضرور۔ دیدی کی جوتی کو چاٹ کر چمکانے۔“ یہ سن کر کمینہ بھڑک اٹھا۔ رمضان قصائی کے تختے سے بغداد اٹھا کے میرے درپے ہوا۔ وہ تو کچھ لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا ورنہ واردات ہو جاتی۔ میں نے بھی کہہ دیا: ”سالے اسی بغداد سے تمہاری انتڑیاں نکال کر غفور دھنیا کو دے کر کہوں گا لے چاچا! تانت بنا لے ان سے۔“ سنا ہے کم ذات کی ”دھرم رکھشکوں“ سے آنت سانٹ ہے۔ مجھے معلوم ہے ممتاز دیدی پر اس کی بری نظر ہے۔“

”بس کر کلو! بس کر۔“

ملک صاحب نے حقے کی منہنال چار پائی سے ٹھونک کر غصے میں کہا:
”اس سؤر کے بچے کی یہ ہمت۔ اس کا حقہ پانی نہ بند کروایا تو میں فضل الرحمن کی
اولاد نہیں۔“

”جس کے پاس حقہ ہی نہ ہو اس کو پانی کی کیا ضرورت ابوجان!“
کلو نے ملک صاحب کا پاؤں پکڑ کر کہا:

”ابوجان! زمانے کی ہوانے رخ بدل دیا ہے۔ کل تک جو رکاب پکڑ کر آپ کو
گھوڑے پر بٹھاتے تھے آج ان کے طویلے میں لوٹے ہوئے گھوڑے قطار میں کھڑے
ہیں۔ بھڑوے اپنی ذات دکھانے لگے ہیں۔“
ملک صاحب کی آواز بھاری ہو گئی۔ بولے:

”کلو بیٹا! چار پائی کے پائے کے برابر تھا تو جب تیرے باپ کو بھالو نے پھاڑ
کے کھایا تھا۔ تیری ماں نے ندی میں کود کر جان دی تھی۔ تو دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا ہو گیا
یقین نہیں آتا۔“

”اوپر والے نے جو چھینا اس کے بدلے میں اس سے کہیں زیادہ دے بھی تو
دیا۔“

کلو نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا۔
”کلو بھیا!“

ملک صاحب نے کروٹ بدل لی:
”جاؤ گل افروز دیدی بلار ہی ہے۔“

”آیا چھوٹی دیدی!“

وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گل افروز کو دیکھ کر مصنوعی غصہ منہ پر لا کر بولا:

”ہے خدا تمہیں میرے آب و دانہ کے لئے یہی گھر چننا تھا۔“

”کیا بولا؟ نامراد! نمک حرام!“

گل افروز اس کے بال کھوٹنے لگی:

”دیکھو چھوٹی دیدی! چاہو تو مجھے کوئی بھی گالی دو مگر نمک حرام مت کہو۔ میں کسی

روز اپنے جسم کا سارا نمک نکال کے ابو جان کے قدموں میں ڈال کے ہمیشہ کے لئے یہاں

سے چلا جاؤں گا۔“

”چلا تو بعد میں جا۔“

گل افروز نے بازو پکڑ کر اسے کھینچا:

”چل بڑی آپا کچھ پوچھ رہی ہے۔“

وہ ممتاز محل کے کمرے میں داخل ہوا تو تینوں بہنوں نے اسے گھیرا:

”کیسے حالات ہیں؟ کہاں کہاں مار دھاڑ ہوئی ہے؟ کس کس گاؤں میں آگ لگی

ہے۔ اور یہ ناس پیٹے صدمہ کانے نے کیا کہا تھا؟“

”میں ایسی باتیں عورتوں سے نہیں کہتا۔ جو کہنا تھا کہہ چکا ہوں ابو جان سے۔“

یہ کہتے ہوئے کمرے سے جان بچا کر نکل گیا۔ ملک کی منجھلی بیٹی ثریا دہشت زدہ ہو کر کو بولی:

”مجھے تو پہلے سے ہی دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ میری سہیلی شیاما نے اشاروں

ہی اشاروں میں بہت کچھ بتایا تھا۔ میں ٹکڑی ہی سمجھنے سے قاصر رہی۔“

کلو ابھی برآمدے میں ہی تھا کہ ملک صاحب کے بڑے بیٹے ایاز محمد نے آواز دی:

”کلو ذرا ادھر آ۔“

کلو نے جب میاں بیوی کے چہرے پر زردی دیکھی تو جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں چھید کر دیا۔ پوچھا:

”بولیے بڑے بھیا! کیا بات ہے؟“

”وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا بات ہوئی ہے۔ اس صدمہ کا نے نے کیا کہا ہے؟“

کلو نے اپنے سر پر دو ہنٹر مارا۔ بولا:

”کیڑے پڑیں میری زبان میں۔ بھیا آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اس بد ذات سے میں خود نیٹ لوں گا۔ اسی کی گلی میں جا کر اس کے گلے پر بغداد نہ پھیرا تو کلمہ بھوشن میرا نام نہیں۔“

یہ کہہ کر وہ نظریں جھکائے کمرے سے نکل گیا۔

آج بستی سے دور اس حویلی میں گہری ادا سی چھا گئی۔ دن کا تیسرا پہر تھا کہ گاؤں کے چودھری نزل سنگھ دس بارہ آدمیوں کی سنگت میں وارد ہوئے۔ ملک صاحب کا ماتھا انہیں دیکھ کے ہی ٹھنکا۔ ان کی تشویش اور اضطراب میں اضافہ ہوا۔

کلو نے سب کو پر نام کیا۔ نزل سنگھ کے پاؤں چھو کر آشیر واد لیا۔ چلم میں نیا تمباکو بھرا اچھی طرح انگاروں کو دھکایا اور چوکے میں جا کر مہمانوں کے لئے ناشتہ تیار کرنے لگا۔ چودھری نزل سنگھ نے حقہ پی کر ادھر ادھر کی کچھ باتیں کر لیں اور آخر پر اپنی آمد کا مدعا بیان کیا:

”ملک صاحب! ملک کے حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔ بھائی بھائی کا گلا

کاٹنے پر اتا ولا ہو رہا ہے۔ گاؤں گاؤں بستی بستی آگ زنی، قتل اور اغوا کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ کون کب کس کا کہاں اور کیوں گلا کاٹے کچھ بتایا نہیں جاسکتا۔ آپ گاؤں چھوڑ کر آدھا کوس دور آ کر بس گئے۔ اس دوری نے ہمیں آپ کی اور آپ کے گھر والوں کی حفاظت کے حوالے سے تشویش میں ڈال دیا ہے۔ گاؤں میں جو آپ کی ذات کے لوگ ہیں ان کی حفاظت کا ہم نے ذمہ لیا ہے۔ ہمارے نو جوان دن رات تلواریں اور پرچھیاں لیے گاؤں کا گشت لگا رہے ہیں۔ کچھ دن ادھر کی بات ہے کہ شر پسندوں نے گاؤں پر دھاوا بولنے کی کوشش کی مگر ہمارے جوانوں نے ان کی کوشش ناکام بنائی۔ آپ کی حویلی اتنی دور ہے کہ اگر یہاں سے کوئی مدد کے لئے پکارے تو اول تو آواز ہم تک نہیں پہنچے گی اور اگر پہنچ بھی گئی تو کیا معلوم کہ ہمارے پہنچ جانے تک آپ مدد لینے کے لائق ہو گئے بھی یا نہیں۔ آپ سیانے ہیں سمجھ سکتے ہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

یہ سن کر ملک صاحب متفکر ہو گئے۔ پوچھا:

”تو نزل جی کیا کرنا چاہیے؟“

چودھری نے اطمینان سے جواب دیا:

”میرا خیال ہے کہ جب تک مصیبت کے بادل نہیں چھٹتے آپ گاؤں میں ہی محفوظ ہیں۔ جگہ کی کوئی کمی نہیں۔ آپ کے مزاج کے مطابق کھانا پینا بھی میسر کرنے کی کوشش کریں گے۔“

ملک کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ ایک عجیب ملال انگیز کیفیت طاری ہو گئی:

”کبھی سان گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے۔“

ملک کی آنکھیں چھلک پڑیں:

”اب میں تین جوان بیٹیوں اور بہو کی عصمت کا بوجھ سر پر اٹھائے کہاں کہاں در بہ در پھروں گا۔ پھر بھی آپ کی تجویز پر عمل کروں گا۔ مگر آج کی رات نکالنے دیجیے۔ مستورات کا معاملہ ہے۔ کل تڑکا ہونے تک ہم آپ کی پناہ میں آجائیں گے۔“
یہ سن کر سب لوگ اٹھ گئے اور ملک صاحب اپنا سر پکڑ کر رونے لگے۔

رات کو دسترخوان تہہ ہوا تو ملک صاحب نے سب افرادِ خانہ کو دیوان خانے میں جمع ہونے کو کہا۔ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے لگے۔ لفظ جیسے خوف کی وجہ سے ان کے گلے میں انک گئے تھے۔ ملک صاحب نے گلا کھکا کر کہا:

”سب لوگ آج کی رات چوکنار ہیں گے۔ ان شاء اللہ فجر کی نماز کے فوراً بعد ہم گاؤں کی طرف کوچ کریں گے۔ سب اپنی ضروریات کی چیزیں سمیٹ لیں۔ اگر خدا نخواستہ کوئی آفت آن پڑی تو میرے سوا کوئی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے گا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں دروازوں پر کنڈیاں چڑھا کے سکون سے بیٹھیں گے۔ آج کی رات بھاری ہے۔ زل سنگھ کا اپنی بندوق یہاں چھوڑ کے جانا کافی معنی خیز ہے۔ کلو ابھی کے ابھی شاہ پور روانہ ہوگا۔ وہاں جا کے تمہارے چاچا وکیل احمد کو میری طرف سے پیغام دے گا کہ وہ بھی اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ سیلا پور پہنچیں۔“

یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہوئے۔ کلو نے روتے ہوئے ملک کے پاؤں پکڑے:

”ابو جان! میں آپ سب کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گا۔ باہر اتو بول رہے ہیں۔ کوئی منحوس بات ہونے والی ہے۔ میں یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا۔“

بارے ملک کے بہت سمجھانے کے بعد وہ لائین کی لو نیچے کر کے نکل پڑا۔

ملک کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جو لوگ مسیحا بن کر آئے تھے ان میں ایک شیطان ہوگا جس کی مخبری سے آدھی رات کو ان کی حویلی پر دھاوا بول دیا جائے گا۔ جب تک کچھ حملہ آور پھانک توڑتے تب تک بہت سے دیوار پھاند کے صحن میں جمع ہو گئے۔ کسی کے ہاتھ میں تلوار، کسی کے ہاتھ میں برچھی تو کسی کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ صمد کانے نے ملک کو پکارا:

”ابے او ملک کے بچے! کہاں چھپ کے بیٹھا ہے۔ باہر نکل اور دیکھ تیرا داماد بارات لے کر آیا ہے۔“

آوازن کر ملک نے اپنی خاندانی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ مستورات کو ایک کمرے میں جمع کیا۔ صندوق کھول کر چار تلواریں نکالیں ایک خود رکھ لی اور تین اپنے بیٹوں کی طرف بڑھائیں۔ نزل سنگھ کی بندوق کندھے میں ڈال کے ایک تلوار کے ہتھے پر کس کے ہاتھ رکھا۔ نہایت سکون اور اطمینان سے اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوئے:

”میرے بچو! سنو۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔ اس کا فیصلہ اللہ کرتا ہے کہ کون کتنا جئے گا کب مرے گا، کہاں اور کس حال میں مرے گا۔ مرنے کا خوف بے ایمانوں کو ہوتا ہے۔ اللہ کا نام لو اور جب تک میں نہ پکاروں کوئی اس کمرے سے باہر نہ آئے گا۔“

یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اترنے لگے۔ دروازہ کھولا اور لکار کر کہا:

”رک جاؤ۔ کوئی آگے بڑھا تو بھون ڈالوں گا۔“

ملک کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر سب پیچھے ہٹ گئے۔ مگر بھیڑ میں سے صدکا نال نکل کر ملک کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی:

”ملک! نادان انسان! کتنے کارتوس ہونگے تیرے پاس۔ پانچ؟ دس؟ چلو بندرہ۔ مگر عقل کے اندھے ہم سو سے زیادہ ہیں۔ گولی چلی تو پھر تیرا اور تیری بیٹیوں کا کیا حشر ہوگا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“

ملک نے بندوق کی نال نیچی کر دی۔ صدکا نے نے بھیڑ کو ایک نظر دیکھا۔ بولا:

”مجھے تو اپنی دلربا ممتاز محل چاہیے۔ باقی یہ لوگ آپس میں بانٹ لیں گے۔ البتہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اندر جانے سے پہلے تجھے اور تیرے تینوں بیٹیوں کو حفاظت کے ساتھ آدھا کوس دور چھوڑ کے آؤں گا۔ بولو منظور ہے؟“

ملک نے بندوق کندھے پر رکھ کر کہا:

”مجھے منظور ہے۔ مگر تمہیں دو گھڑی انتظار کرنا پڑے گا۔“

وہ دوواڑہ بند کر کے اندر چلے گئے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد پے در پے گولیوں کے پانچ دھماکے ہوئے۔ حملہ آور گولیوں کی آواز سن کر ششدر رہ گئے۔ پھر ملک نے دروازہ کھولا۔

بولے:

”اندر تمہارا مال پڑا ہے۔ آؤ اور لوٹ لو۔“

پہلا حملہ آور جب آگے بڑھا تو ملک کی تلوار زنائے سے ہوا میں لہرائی اور حملہ آور کا سر دور جا کر گر پڑا۔ ملک صاحب نے اپنے بیٹیوں کو آواز دی۔ خونریز جھڑپ کے بعد حملہ آوروں میں سے دس کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔ باپ اپنے بیٹیوں کے ساتھ خون کی

ندی میں ڈوبا ہوا اپنے اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ صدمہ کا نا جب سارے مکان کی تلاشی کے بعد ہانپتا ہوا نیچے آیا تو خون میں لت پت ملک کو ٹھوکر مار کر کہا:

”اس حرامی نے میری ممتاز کے ساتھ سب عورتوں کو مار ڈالا ہے۔“

پیچھے سے کسی نے اس کی کمر میں برچھی گاڑ دی۔ وہ لہراتا ہوا منہ کے بل گر گیا۔ کسی نے کہا:

”لو بھائیو! دولہا اپنی دلہن کے پاس پہنچ گیا۔ بدھائی نہیں دو گے۔“

وحشی قہقہوں سے ڈر کے پرندے بھرامار کے شاخوں سے اڑنے لگے۔ دور شاہ پور میں جب کلو نے بندوق کے دھماکے سنے تو اس کے ہاتھ سے لالٹین گر گئی اور اندھیرے میں اس کی چیخ سنائی دی:

”ہائے ابوجان۔ ہائے اتی جان۔“

وہ پاگلوں کی طرح چلا چلا کر بھاگنے لگا۔ وکیل احمد ان کی بیگم اور دو بیٹیاں بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔

دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔



مہر سنگھ

دشمن کے خون سے موت کے گھاٹ پر تلک لگانے والا راجپوت



گلابی جاڑے کا ایک دھندلا دھندلا سادن ڈھلنے کو ہے۔ السایا ہوا سورج افق کی طرف آنکھیں موند موند کے دیکھ رہا ہے۔ ایک سرد جھونکا جنگلی پھولوں کے جھاڑ سے زور سے ٹکرایا۔ اونگھتی ہوئی شاخوں نے چونک کر جھر جھری لی۔ زرد پتیاں شاخوں سے ٹوٹ کر کالی چٹانوں پر بکھر گئیں۔ لگتا ہے جیسے چٹانوں پر دھاری دار سانپوں کی کینچلی چمک رہی ہو۔ چیز کے پیڑوں پر سرخی مائل کرنیں ٹٹمار رہی ہیں۔ افق کی نوک پر ایک سرخ بادل جیسے سورج کو وداع کر رہا ہے اور سورج سر جھکائے دن بھر کے غموں کا بوجھ پہاڑ کے اس پار پٹکنے کی بے تابی میں لڑکھڑانے لگا۔

ایک خوفناک شام کی پسلی سے ڈراؤنی رات کراہتے کراہتے پیدا ہو رہی ہے۔ رات کراہ رہی ہے کہ وقت کی تتلی کے پروں میں نیزہ گڑا ہے اور وہ آخری سانس لے رہی ہے۔ ریشم سے بھی نازک ہچکیوں کے گداز سے آسمان کا کلیجہ پگھل رہا ہے۔ کالی چٹان کی اوٹ میں پناہ لینے والے قبیلے کے معصوموں کی شبہم سے بھی نازک سسکیاں سن کر نیک روئیں بین کر رہی ہیں۔

کسی کی کائنات برابر گود چھن گئی تو کسی کے سر سے آسمان برابر سایہ۔ موت کا بیم انسان کی رگوں کو اندھی بڑھیا کے ہاتھوں سے کاٹا ہوا سوت بنا دیتا ہے کہ کسی کے باپ کا سر کاٹا گیا اور وہ بھاگ گیا۔ کسی کی ماں کی عزت لوٹی گئی اور وہ دوڑ پڑا۔ کسی کی ماں یا بہن کی کوکھ میں خنجر اتارا گیا اور وہ نکل گیا۔ کسی کی اولاد کو نیزے پر اٹھایا گیا اور وہ کھسک گیا۔ سب اپنے اپنے حصے کے سانحوں کا بوجھ گھرائی ہوئی سانسوں پر لا دکر ڈھور رہے ہیں۔ دور پرے گاؤں گاؤں میں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ راکشس تانڈو کر رہے ہیں اور کیلاش پر بت پر مہامائی بال کھولے ماتم کر رہی ہے۔

کہیں اندھیرے کے سینے میں ایک کرن کی دھڑکن سنائی دی۔ چودھری ہدایت اللہ نے بھری بندوق کا ندھے سے اتاری۔ سرگوشیاں سرگوشیوں کو ڈرانے لگیں۔ ایک کرن، دور اندھیری رات کے سینے پر ریختی ایک کرن۔ ایک ناگہانی آہٹ، رات کے ماتھے پر خطرے کی شکن یا امید کی مسکراہٹ:

”کیا اس کے پیچھے لٹے پٹے قافلے کا تعاقب کرنے والی بربریت ہے؟ کیا کسی بھٹکے ہوئے قبیلے کی لائٹن اپنی اکھڑی ہوئی روشنی سے راستوں کی سوئی ہوئی دھڑکن کو جگا رہی ہے؟ کیا کوئی غول بیابانی ہمیں ڈرا دھمکا کے راستے سے بھٹکانے کے لئے ہماری طرف آرہا ہے۔ مگر ہم تو کب کے بھٹک گئے ہیں۔ کیا خبر کل تلواروں کی چمک سے ہماری آنکھ کھلے۔۔۔ اجالا ہماری شہ رگوں سے اندھیرے کی چادر سر کا کر ہمارے خون کی سرخی سے شفق کے پاؤں میں مہندی لگائے۔“

چودھری ہدایت اللہ نیم درجا کے پل صراط پر ڈولنے لگے۔ مجبوری انسان سے کیا کیا نہ طے کرواتی ہے۔ جب چودھری کی بندوق سے آخری گولی نکلے گی۔ جب تلوار

اٹھانے والے بازو کٹ کٹ کر ڈھیر ہو جائیں گے۔ جب اپنے قبیلے کے مردوں کی لاشوں پر بال کھول کے نوحہ خوانی کا وقت آئے گا، تب سب عورتیں قبیلے کی اپنے اپنے بچوں کی باہ پکڑ کر کھائی میں کود جائیں گی۔

چاندنی میں چٹان کا سایہ اور بھی ڈراؤنا ہو گیا۔ ایک بچے نے جب سائے کی طرف دیکھا تو ہول کے مارے ماں کے سینے سے چمٹ گیا۔ یہ بچہ شام سے اپنی تھوک نلگنے کی کوشش کر رہا ہے کہ نلگنے کے لئے اس کے منہ میں کچھ اور نہیں۔ پھر اسے لگا کہ اس کے منہ میں کانٹے لگے جن میں اس کی زبان الجھ کر رہ گئی۔ حلق میں پھنسی ہوئی سانس کو چھڑانے کے لئے اس نے آخری کوشش کی۔ ایک خوفناک چیخ سے درہ گونج اٹھا۔

”بی بی! بچے کو خاموش کراؤ۔“

”بابا میرے بچے کو پیاس نے اپنی گود میں سلایا۔ اب یہ شاید کبھی نہ جاگے گا۔“

یہ سن کر بابا سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے مشکیزہ اٹھایا اور اندھا دھند بھاگنے لگے۔ کسی آواز نے بابا کا تعاقب نہ کیا کہ آواز سے جھاڑیوں میں چھپے ہوئے درندے جاگ جاتے۔ بابا ڈھلوان پر پھسلتے پھسلتے زخمی ہو گئے۔ انہیں نظر تو کچھ نہیں آ رہا تھا مگر ندی کی قفل سن کر وہ دیوانہ وار آگے بڑھ رہے تھے۔ تبھی بابا نے ایک پکار سن لی:

”رک جاؤ بابا! آگے خطرہ ہے۔“

ان کے سامنے ایک جوان کھڑا تھا۔ جوان نے بابا کی کانپتی ہوئی باہ پکڑ لی۔

”آگے کہاں جا رہے ہو بابا!۔“

”بیٹا یہ بوڑھا قیامت کے دن ایک معصوم کی پیاس کے سوال کا کیا جواب دے گا۔ بچے پیاس سے مر رہے ہیں۔ ندی تک پہنچا دو بیٹا۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔“

اجنبی جوان نے بابا کو آرام سے ایک پتھر پر بٹھا دیا۔ ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا:

”بابا تمہارے ساتھ جو لوگ ہیں وہ کس جگہ چھپے ہیں؟ آس پاس خطرہ منڈلا رہا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ اس جگہ سے کچھ پرے ہم رضا کاروں کے خیمے ہیں۔ ہم تم لوگوں کے خور و نوش کا انتظام کریں گے۔ چلو اٹھو۔“

اجنبی جوان بابا کی باہ پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ کچھ دور چل کر بابا نے پوچھا:

”بیٹا وہ دور کیسی روشنیاں ہیں۔ یہ کون سی بستی ہے؟“

”بابا! دوسو سال سے دور کرو۔ یہ ہم رضا کاروں کے خیمے ہیں۔“

”خدا تم لوگوں کا بھلا کرے۔“

بابا نے پاس آ کر جب خاک کی رنگ کے خیمے دیکھے تو انہیں کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ نوجوان بھیس بدل کر ہم جیسے لوگوں کی ٹوہ میں نکلا ہے۔ پھر جب وہ دونوں خیموں کے پاس پہنچ گئے تو ایک آواز نے انہیں ٹوکا:

”کون ہے وہاں؟ جلدی بتاؤرنہ گولی چلاؤں گا۔“

نوجوان نے پکار کر جواب دیا:

”صاحب سے کہہ دو کہ رنگیلا ہے۔“

یہ سن کر ایک اہلکار اندر گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کر پکارا:

”رنگیلے کو آنے دو۔“

اگرچہ رنگیلے نے بابا کی باہ چھوڑی تھی مگر بابا سمجھ گئے کہ وہ اور اس کے ساتھی کسی بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ بابا کو ایک خیمے کے آگے روکا گیا۔ کچھ دیر بعد رنگیلا ایک فوجی

افسر کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ افسر نے کسی سے پوچھا:

”کہاں ہے؟ بڈھا کہاں ہے؟“

رنگیلے نے بابا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”وہ رہا سرکار!“

فوجی افسر نے دیکھا کہ ایک ضعیف بزرگ اندھیرے میں زمین پر اکڑوں بیٹھا

ہے۔ اس نے بابا کے قریب آ کر سپاہی کو آواز دی:

”لاٹین لے کر آؤ۔“

سپاہی دوڑ کے لاٹین لے کر آیا۔ افسر نے اس سے لاٹین لے کر کہا:

”جاؤ تم۔“

پھر اس نے لاٹین بابا کے منہ کے قریب لائی۔ بابا لاٹین کی دھندلی روشنی میں

آنکھیں چھپکنے لگے۔ ان کی ٹانگیں تھرتھار رہی تھیں اور سردی سے دانت بج رہے تھے۔ تبھی

فوجی افسران کے اور قریب گیا۔ کچھ دیر غور سے انہیں دیکھا۔ پھر بابا کے سامنے خود بھی

اکڑوں بیٹھ گیا:

”بابا! مجھے پہچانتے ہو؟“

بابا نے ٹکٹکی باندھ کے افسر کے منہ کو دیکھنا شروع کیا۔ بولا:

”بیٹا! ان بوڑھی آنکھوں میں اتنا دم نہیں کہ کسی شناسا کی پہچان کریں۔ ہو گے

کوئی فوجی افسر۔“

افسر نے بابا کے شانے پر ہاتھ رکھا:

”صحیح کہتے ہو بابا۔ میں فوجی افسر ہوں۔ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟ اور وہ کہاں

چھپ کے بیٹھے ہیں؟“

بابا نے نظریں اٹھا کر رنگیلے کو دیکھا۔ بولے:

”میں اکیلا ہی جنگل کی طرف نکلا ہوں بیٹا۔“

یہ سن کر رنگیلا بول پڑا:

”صاحب بڑھا جھوٹ بول رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو مجھ سے کہا کہ

میرے ساتھی اسی جنگل میں کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔“

”لغت ہے تم پر۔“ بابا نے رنگیلے کی طرف تھوک کر کہا۔

افسر نے ایک سپاہی کو آواز دی:

”میرا طینچہ لے کر آؤ۔“

سپاہی نے دوڑ کر طینچہ لایا۔ افسر نے کہا:

”اٹھ رنگیلے! بابا کو اپنے ساتھ لا۔ آج کی رات ہم جنگلی بھینسے کا شکار کریں

گے۔“

آگے ایک فوجی جوان لالٹین لیے جا رہا تھا۔ پیچھے افسر اور بابا کی باہ پکڑے

رنگیلا۔ جب کچھ دور پہنچے تو افسر نے رنگیلے سے کہا:

”رنگیلے! بابا کی باہ چھوڑ دے۔“

رنگیلے نے بابا کی باہ چھوڑ دی اور الگ ہو گیا۔ افسر نے لالٹین اپنے منہ کے پاس لائی اور

بابا سے پوچھا:

”ابھی پہچانو مجھے۔“

بابا منہ کھول کے دیکھنے لگا۔ ان کی آنکھیں ٹٹمار ہی تھیں:

”کون ہو تم؟“

افسر نے پوچھا:

”بابا تمہارے ساتھ اور کون ہے؟“

بابا کی گردن ہل رہی تھی۔ کانپتا ہاتھ کان کے قریب لا کر بولا:

”ہاں، کیا پوچھا تم نے؟“

”گھر والے کہاں ہیں تمہارے!“

بابا نے چیختے ہوئے کہا:

”سب مٹ گیا۔ سب کچھ مٹ گیا۔“

پھر بابا کھل کے رونے لگے۔ انہیں لگا کہ انہوں نے کتنے دنوں کے بعد سانس لی

ہے۔ افسر نے بابا کو سہارا دے کر اٹھایا اور کہا:

”جاؤ چاچا چلے جاؤ۔“

رنگیلہ سن کر حیرت زدہ ہو گیا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولا:

”مگر صاحب! ہاتھ آئے شکار کو چھوڑنا صحیح نہیں۔“

افسر نے اس کے کان میں کہا:

”رنگیلے! تو آسمان زمین پر لا پھر بھی نہیں بتائے گا کہ اس کے ساتھی کہاں ہیں۔

اس کے ساتھ جا کے پتہ لگا کہ کہاں سب چھپ کے بیٹھے ہیں۔“

رنگیلہ نے بابا کی باہ پکڑ لی:

”چلو بابا۔“

بابا بنا کچھ کہے چل پڑے۔ ابھی وہ دس ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ بندوق سے

گولی چلی اور رنگیلا دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ بابا نے پیٹھ پھیر کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

صبح جب چودھری ہدایت اللہ کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے کہ فوجیوں کی ایک ٹکڑی نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ انہوں نے حیرت سے کپٹن مہر سنگھ کو ایک چٹان پر اونگھتے ہوئے دیکھا۔ ان کی رائفل مہر سنگھ کی گود میں تھی۔ چودھری کے دماغ میں بجلیاں کڑکنے لگیں:

”سچ کہتے ہیں سویا سویا برابر۔“

انہوں نے بابا کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ بابا نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا۔ پھر شرمندہ ہو کر گردن جھکائی۔ بابا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چودھری ہدایت اللہ سوچنے لگے:

”مہر سنگھ راجپوت ہے۔ دن کے اجالے میں دشمن کے خون سے موت کے گھاٹ پر تلک لگانے والا راجپوت۔ دشمن پر لٹکار کے ٹوٹ پڑنے والا یہ راجپوت اتنا سفاک نہیں ہو سکتا کہ بے بس۔“

انہیں مہر سنگھ کی آواز نے چونکا دیا: ”کیا سوچ رہے ہیں جناب؟“

چودھری نے کہا:

”کپٹن ہمارے اور ہمارے اللہ کے بیچ دور کھت کی نماز ہے۔“

یہ سن کر مہر سنگھ اٹھ کر چودھری کے پاس گیا۔ ان کی رائفل لوٹاتے ہوئے کہا:

”میجر چودھری ہدایت اللہ کے سینے پر چلنے والی گولی اگر کپٹن مہر سنگھ کے سینے

میں چھید کر کے پار ہو سکتی ہے تو میجر ہدایت اللہ جانے کہ ان کے رب نے انہیں بلایا ہے۔“

یہ سن کر چودھری نے مہر سنگھ کو گلے لگایا:

”شکر یہ کپٹن۔“

کپٹن مہر سنگھ نے بابا کی طرف دیکھ کر کہا:

”خدا بخش چاچا! تم نے مجھے پہچاننے سے انکار کیوں کیا؟“

پھر انہوں نے گھٹنے تک ہاتھ لا کر کہا:

”اتنا تو تھا میں جب تمہارے کندھوں پر سواری کرتا تھا۔ اور وہ کیا کہا کرتے

تھے تم سائنسی علم دریاؤں ہے۔“

خدا بخش کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

مہر سنگھ بولا:

”چاچا اس لالچی گدھ کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں نے درجن سنگھ کو تمہارے

پیچھے لگایا۔“

پھر مہر سنگھ نے درجن سنگھ کو آواز دی:

”درجن سنگھ اپنے کرنل کو سیلوٹ نہیں کرو گے؟“

درجن سنگھ دوڑ کے آیا اور چودھری کو گلے لگا کر رندھے ہوئے لہجے میں کہا:

”جناب! اس سردار نے آج ایک بھی گولی چلائے بغیر زندگی کی سب سے بڑی

جنگ جیت لی ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو ایک دلیر فاتح کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔

صبح کے دھندلکے میں اس قافلے نے سرحد پار کی۔ کلو درجن سنگھ کی باہ پکڑ کر

دیر تک ہاتھ ہلاتا رہا۔ وکیل احمد اور ان کے گھر والے اسے مڑ مڑ کے دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے کپڑوں کو بار بار چوم رہا تھا جن پر اس کے مالکوں کا خون لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ صحن میں پڑی اس کے ابو جان محمد کا جسم اب تک لرز رہا ہے:

”کلو بیٹا آگئے تم؟“

اس نے آنکھیں موند لیں اور دھاڑ دھاڑ کر رونے لگا۔ مہر سنگھ نے اسے سینے سے

لگایا۔



ضیاء الدین

اپنی بہن ارچنا دیوی کو گھاٹ پروداغ کرنے والا خادم

Handwritten text in Devanagari script, appearing as bleed-through from the reverse side of the page. The text is faint and mostly illegible due to fading and the nature of the paper.

Handwritten text in Devanagari script, appearing as bleed-through from the reverse side of the page. The text is faint and mostly illegible due to fading and the nature of the paper.



سیب کے بانگوں کے بیچ وہ مکان جاگیردارست لال کے باپ کشوری لال نے بنوایا تھا۔ اس دو منزلہ مکان کے وسیع و عریض کمروں میں آس پاس کے دیہات کے کسانوں سے لیا ہوا اناج جمع کیا جاتا۔ چھت کے نیچے ایک چھوٹے سے کمرے میں چوکیدار قاسم خان اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک سال جنوری کے مہینے میں کئی دن لگاتار برف گری۔ قاسم خان دن میں کئی بار گھاس کی چھت پر چڑھ کر برف گراتا رہا۔ ایک رات برف کے بوجھ سے چھت کی کڑیاں چرمرانے لگیں تو قاسم ہول جوں میں چھت پر چڑھ کر برف گرانے لگا۔ اندھیرے میں پاؤں پھسل گیا اور برف کی ایک موٹی چار د کے پیچھے پیچھے یہ بھی دھڑام سے گر گیا۔ جب بھد بھد کی آواز آنا بند ہوئی تو قاسم کی بیوی ریشماں بی بی اسے پکارنے لگی۔ کچھ دیر تک جب جواب نہ ملا تو وہ گھبرائی۔ ہڑبڑاہٹ میں نیچے آ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر دہلیز پر اتنی برف جمع ہو گئی تھی کہ اکیلی عورت سے دروازے کا کھولنا ناممکن تھا۔ وہ اپنے شوہر کو پکارتی تھی۔ بچے خوفزدہ ہو کر دھاڑیں مامار کر رہے تھے۔ ریشماں بی بی سے جب کچھ نہ بن پڑا تو دوسری منزل سے کود گئی۔ چمک

سے تڑپتی اپنے شوہر کو آواز دینے لگی۔ مگر قاسم کہیں ہوتا تو سنتا۔ اسے تو جیسے آن کی آن میں قاف کی پریاں اپنے ساتھ اڑا کر لے گئی تھیں۔

ریشماں بی بی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ چلا چلا کر مدد مانگ رہی تھی کہ اس کے سوا اس سے کچھ نہیں بن پڑتا تھا۔ آخر تھک ہار کر اس نے حویلی سے مدد مانگنے کا ارادہ کیا۔ وہ سینے تک برف میں دھنستے ہوئے ہانپتے کانپتے حویلی کے پھاٹک تک پہنچ گئی۔ اس کی دھاڑ پر حویلی میں کچھ دیر کے لئے ایک چراغ جلا۔ اس کے من میں امید کی ایک کرن جاگ گئی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد چراغ بجھ گیا اور وہ اپنے منہ پر دو ہتھڑا مارتے ہوئے برف پر گر گئی۔

پھر ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ اس نے پھٹی آنکھوں سے اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ شوہر کی محبت میں یہ بے کس عورت اپنے بچوں کو بھول گئی تھی۔ کہتے ہیں جب محلے کے لوگوں نے دو دن بعد برف ہٹا کر قاسم کی اکڑی ہوئی لاش نکالی تو ریشماں بی بی اپنے بال کھسوٹتے ہوئے اس کا ماتم کرنے لگی۔ اور جب چھت کے بلے سے اس کے دونٹھے بچوں کو نکال کر اس کے سامنے دھرا گیا تو وہ سن ہو گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے دونوں لال گہری نیند سو رہے ہیں۔ پھر اس کے منہ سے ایک بھی آواز نہ نکلی۔ کچھ دن بعد باؤلی ہو کر گلیوں میں اپنے شوہر اور بچوں کو پکارتی رہی۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر محلے کی بیبیاں بین کرتیں۔ کچھ عرصہ بعد اس کے بدن پر چیتھڑے رہ گئے۔ اور وہ بڑبڑاتے ہوئے برف کو سوس رہی تھی۔

ویران مکان کی طرف لوگوں نے جاتا چھوڑ دیا کہ وہاں سے راتوں کو بچوں کی کلکاریاں سنائی دیتی تھیں۔ کشوری لال کے دل میں یہ ڈر بیٹھ گیا کہ راتوں کو قاسم اور اس

کے بچوں کی آتماں ویرانے کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں ریشماں کی درد بھری پکار سن کر کشوری لال کے چھوٹے بھائی نند لال نے چراغ جلایا تھا۔ اتنی بھیانک برقی رات میں اس نے سوچا کہ کوئی چڑیل چیختے چلاتے گھوم رہی ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا اور ایک دن ندی سے اس کی پھولی ہوئی لاش نکالی گئی۔ پیرسز بادشاہ کا وظیفہ مکمل کرنے کے بعد جلال الدین کو اس ویرانے میں قرار پکڑنے کا حکم ہوا۔

پھر ایک دن جلال الدین نے حویلی کی ڈیوڑھی سے کشوری لال کی ارحمی نکلے دیکھی۔ ایک مہینے کے بعد اپنی ماں کی چتا کو ست لال نے اگنی دکھائی۔

وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ڈر کی وجہ سے جس ویرانے کی طرف حویلی کی کوئی کھڑکی نہیں کھلتی تھی اسی میں کشوری لال کے بیٹے ست لال نے اپنے خاندان کے ساتھ پناہ لی۔ اس شام جب حویلی پر دھاوا بولا گیا تو بھیانک آوازوں سے پناہ گزینوں کی بوٹی بوٹی کانپ اٹھی۔ آگے آگے مشعلیں لئے مددگار پیچھے پیچھے بدوق بردار قبائلی۔ حویلی کا کونا کونا چھانا گیا مگر نہ کافر ہی ملا نہ اس کا چھوڑا ہوا مال وزر۔

غصے میں ان کے سردار نے دیواروں پر لٹکتی ست لال کے پرکھوں کی تصویروں کو خنجر کی نوک سے مسخ کیا۔ پھر اس نے ایک رضا کار سے پھر کر پوچھا:

”اوائے خانہ خراب! کہاں ہے کافر؟“

رضا کا خوف سے تھر تھرانے لگا:

”خبر تو سچی ہے خان صاحب کہ ابھی نکلے نہیں ہیں۔“

خان نے تڑخ کر کہا:

”زمین کھود کر نکالو خنزیر کی اولاد کو۔“

پھر چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے۔ دور دور تک کھیتوں اور باغوں کا چپہ چپہ چھان مارنے کے بعد جب کچھ حاصل نہ ہوا تو توویرانے کو حصار میں لیا گیا۔ آوازیں سن کر ست لال اور اس کے افراد خانہ تھر تھر کانپ اٹھے۔ بچوں کے تو خوف سے پا جاے گیلے ہو گئے۔ گلنا زبی بی یہ دیکھ کر بے چین ہو اٹھی۔ کسی نے کہا:

”خیشو! اندر جا کر دیکھو کسی کونے میں دبک کر بیٹھے ہونگے۔“

یہ سن کر گلنا ز گھبرائی۔ اپنے خاوند سے شکایت بھرے لہجے میں کہا:

”تم دیکھتے نہیں کہ وہ وحشی ہاتھ میں ننگی تلوار لیے چوکھٹ تک آ گیا۔ کیا تم معصوموں کے سر پر یہ تلوار گرتے دیکھ سکتے ہو۔ بچوں کی موم جیسی گردن پر خنجر چلتے دیکھنے کی ہمت ہے تم میں؟ جلال الدین تمہیں قسم اپنے رب کی انہیں بچانے کے لئے کچھ کرو۔“

جلال الدین نے سر دآہ بھر کر کہا:

”گلنا ز! ہمیں آدم زاد کے معاملات میں دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں۔“

یہ سن کر گلنا زبی بی سے رہانہ گیا اور اس نے منہ سے وہ بھیانک چیخ نکالی کہ حملہ آور کانپتے ہوئے بھاگنے لگے۔

آدمی رات کا سماں تھا کہ پٹوں کی کھڑکھڑاہٹ سے گلنا زبی بی چونک اٹھی۔ دیکھتی کیا ہے کہ ضیاء الدین بغل میں پوٹلی دبائے ویرانے کی اور دبے پاؤں چلا آ رہا ہے۔ اس نے چوکھٹ پر رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ جب اطمینان ہوا کہ دور دور تک کوئی نہیں تب ٹوٹا ہوا دروازہ ایک طرف رکھ کر اندر آیا۔ گری ہوئی دیوار کے بلے کو پھاند کر سرگوشی میں ست لال کو آواز دی۔ ست لال نے آواز پہچانی اور چھلانگ لگا کر اس کے پاس پہنچا۔ گھبراہٹ سے

اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے پوچھا:

”ضیاء الدین! شہر کا کیا حال ہے؟“

ضیاء الدین نے پوٹلی تھمتے ہوئے کہا:

”شہر گھبراہٹ میں۔ پوٹلی میں مہتاب بیگم کے دو جوڑے ہیں۔ ایک مالکن کے لئے ایک بہو کے لئے۔ یہاں زیادہ دیر قرار کرنا اب مناسب نہیں۔ باہر بڑی ہڑبونگ مچی ہے۔ اگر کسی نے اگر ٹوہ لگائی تو غضب ہو جائے گا۔ میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔“

جاگیردار ست لال کی بیوی نے جو پوٹلی کھولی تو کپڑے اپنے شوہر کے منہ پر دے کر بولی:

”میں نہ پہنوں گی یہ کپڑے۔ ان سے گوالن کے جسم کی بدبو آ رہی ہے۔ میں تو الٹی کر کے مر جاؤں گی۔“

ست لال نے ڈپٹ کر کہا:

”زبان جل جائے تیری نامراد۔ ضیاء الدین باہر سن رہا ہے۔ اگر مصیبت کی اس گھڑی میں اس نے بھی پیٹھ دکھائی تو اپنے ٹبر کے ساتھ قصائی کے کانٹے پر لٹکتی نظر آئے گی۔“

اس کی بیوی ارچنا دیوی نے کراہت سے کپڑے پہن تو لیے مگر زہر میں بجھا ہوا تیر چھوڑنے سے باز نہ آئی:

”ہائے بھگوان! یہ کیسا بھوک پڑا۔ اب مجھے نوکرانی کا جوڑا پہننا پڑا۔ اس سے اچھا تو یہ تھا کہ میں اپنا منہ کالا کرتی۔ ہانڈی گلے میں ڈال کر پھانسی چڑھ جاتی۔“

ست لال نے غصے میں اپنی بیوی کو چاشا مارا:

”ارے بد بخت! وہ باہر بیٹھا سب سن رہا ہے۔“

بچوں اور بہو نے روتا شروع کیا۔ بڑے بیٹے نے رو ہانسا ہو کر باپ سے کہا:

”بھگوان کے لئے پتا جی آپ ہی خاموش ہو جائیے۔“

ست لال باہر جانے لگا۔ پلٹ کر اپنے بیٹے سے کہا:

”اس چڑیل کو سمجھاؤ کہ ضیاء الدین کی بیگم کوئی اس کی نوکرائی نہیں۔“

باہر جو ضیاء الدین کو دیکھا تو گردن ست لال کی جھک گئی۔ ضیاء الدین اس کے پاس گیا۔

بولا:

”گردن جھکا کر اپنے نمک خوار کو شرمندہ نہ کیجیے۔“

یہ سن کر ست لال نے لپک کر اپنے خادم کو گلے لگایا۔ دونوں کی سسکیاں سن کر گلنا زبی بی رونے لگی۔

اگلی رات اندھیرے کے سفاک ماتھے پر ایک موہوم سی کرن چمک اٹھی۔ بندی برابر روشنی کے پیچھے ایک سہاگن کے سندور برابر امید۔ امید کا ہالہ پھیل کر سارے آسمان پر چھا گیا اور آسمان گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک خاندان کے لئے راستہ بننے لگا۔ پراسرار تاریکی میں ایک کشتی لب ساحل، جیسے کسی حبشی حسینہ کے رخسار پر تل۔ ندی کا سینہ زخموں سے چھلنی۔ لگتا تھا سارا پانی زخموں کی آنکھوں سے بہہ کر دور سرحد کے اس پار کہیں سوکھ گیا ہے اور کشتی سیاہ رات کے مہیب ٹیلے کے سائے میں اوٹھ رہی ہے۔ ضیاء الدین نے لائین کی لوپچی کر دی تھی۔ مدہم روشنی میں اس کے منہ سے سسکاری کے برابر پکار نکلی:

”جبار!“

جتار نے پتوار سے کشتی کا فرش کھڑکا کر اپنے ہونے کا اشارہ کیا۔ ستائے کو بھی معلوم نہ ہوا کہ کشتی کے پاس کتنے لوگ اپنی سانس روکے کھڑے تھے۔ ضیاء الدین نے پوچھا:

”شعبان کہاں ہے؟“

جتار نے کھونٹے سے کشتی کی رتی کھولتے ہوئے کہا:

”لکھا تو میرے پیچھے پیچھے ہی تھا اچانک جانے کہاں کھو گیا۔ اندھیرے میں نظر نہ آیا۔ خوف سے پکار نہ سکا۔ میرے خیال میں سارے لنگڑے کی نیت ڈول گئی۔ سب مال و دولت جاگیر دار کالے کر بھاگ گیا۔“

یہ سن کر ضیاء الدین ستائے میں آیا۔ ست لال کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ ضیاء الدین کفِ افسوس ملتے ہوئے بولا:

”غلط آدمی پر بھروسہ کیا جتار۔“

ست لال کو یقین تھا کہ شعبان ایسا دھوکا نہیں کرے گا۔ بولا:

”نہیں ضیاء الدین! کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوگا۔ آئے گا ضرور۔“

جتار نے نسوار کی چٹکی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا:

”اپنے آپ کو جھوٹا دلاسا نہ دو جاگیر دار۔ میں تو کہتا ہوں کشتی میں بیٹھو۔ کب کہاں سے گھات پڑے معلوم نہیں۔ اور پھر بچ رہے تو روپیہ پیسہ اور سونا چاندی پھر آئے گا۔ جان بچی تو لاکھوں پائے۔“

ضیاء الدین کا خیال بھی یہی تھا مگر کچھ کہہ نہ سکا کہ کہیں ست لال کو کچھ اور شک نہ ہو جائے۔ دے لفظوں میں اس نے بھی اگرچہ جتار کی تائید کی مگر ست لال کا یقین اٹل تھا۔

اس نے اپنا فیصلہ سنایا:

”جبار کو روانہ ہونے دو ضیاء الدین۔ ہم شعبان کا انتظار کریں گے۔ اور پھر کشتی تو اس کے پاس بھی ہے۔ ہمیں کون سے خشکی کے راستے سے جانا ہے۔“

ست لال یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ندی کے پار سے ایک دردناک چیخ سنائی دی۔ گھبرا کر ست لال نے اپنے افراد خانہ کو کشتی میں بٹھایا۔

”نکل لو جبار! ان کو لے کر فوراً نکل لو۔“

ست لال کو چھوڑ کر جب سب لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو ضیاء الدین جبار کو سمجھانے لگا:

”سن جبار! میری بات غور سے سن۔ صبح صادق کا دھند لکا چھانے سے پہلے اگر جھیل کو پار کیا تو سب بچ رہیں گے۔ دریا کے درمیان سے ادھر ادھر مت بھٹکنا۔ کوئی صدا دے تو پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔“

پھر اس نے ست لال کے کاندھے سے اس کی بندوق اتار کر اس کے بڑے بیٹے پران ناتھ کو سونپی۔ اور اسے ہدایت دی:

”پران ناتھ! حملے کی صورت میں ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ اگر جبار نے غداری کی تو اسے گولی سے اڑا دینا۔ اور ہاں اپنی ماما سے کہو کہ اس کے سندور کی ڈھال ضیاء الدین کا سینہ ہے۔“

یہ سن کر ست لال کی گھروالی رونے لگی۔ ہاتھ جوڑ کر بولی:

”ٹھہر جبار! میرے بھائی سے کہو کہ اگر بچ رہے تو راکھی کے دن چوکھٹ پر اس کا انتظار کروں گی۔ جو وہ آنے کا وچن دے تو یہی جاؤں گی۔“

ضیاء الدین منہ ایک طرف کر کے سبکیاں بھرنے لگا۔ ست لال نے اس کے
شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”ضیاء! وعدہ کر کے اپنی بہن کو وداع کرو۔“

”وعدہ۔“

ضیاء الدین کے منہ سے جیسے چیخ نکل گئی۔

کشتی روانہ ہوئی تو چھپ چھپ دل دھڑکنے لگے اور چھپاک چھپاک آنکھوں
سے مینہ برسنے لگا۔



شاہی فرمان

فوج کو بلوائیوں کے ساتھ سختی سے نپٹنے کا حکم



وارث ملک نے مہاراجا کے سفیر سے شاہی فرمان لیا اور پڑھ کے ایک نفرت بھری نظر سفیر پر ڈالی۔ حاضرین کے چہروں پر فکر کی پرچھائیاں اور گہری ہونے لگیں۔ چودھری شجاعت علی نے بے تاب ہو کر پوچھا:

”وارث ملک! کیا فرمان ہے؟“ وارث ملک نے فرمان سفیر کے منہ پر مار کر نہایت حقارت سے کہا:

”تم لوگوں نے سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ہتھیار لگائے اور مہاراجا کے خلاف سست بکتے ہو۔ اس روش کو فوراً ترک کرو۔ اپنے ہتھیار ڈال دو۔ خود کو ہمارے سپاہیوں کے حوالے کر دو۔ ہم تمہارے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کریں گے۔ اگر حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو جبر کی نوبت آئے گی جس کی تم تاب نہ لاسکو گے۔ ہم نے اپنی فوج کو بلوائیوں کے ساتھ سختی سے پنپنے کا حکم دیا ہے۔“

”ہم بلوائی ہیں؟“

چودھری شجاعت علی نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ سفیر سہم گیا۔ اس کی نظریں جھک

گئیں۔ چودھری نے اپنی شہادت کی انگلی سے سفیر کا سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا:
 ”سکھم چند! ہم بلوائی ہیں؟ اور وہ اور اس کی سکی بیوی امن کے پجاری؟ اس
 کے فوجیوں اور ”دھرم رکھشکوں“ نے ہماری بستیوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ بچے، جوان،
 بوڑھے بزرگ بے دردی سے قتل کر دیے۔ ہماری عورتوں کے دامن عصمت کو تارتار
 کر دیا۔ عبادت گاہوں کو اصفیل بنا دیا۔“

غلام حیدر خان نے چودھری کی بات کاٹتے ہوئے بلند آواز میں کہا:
 ”ساتھیو! یہ پیغام اس ظالم اور سفاک کے دربار سے آیا ہے جس کو اگر تم دیوتا بھی
 کہو گے تب بھی وہ ہمارا نام و نشان مٹا کر اپنا دھرم نبھائے گا۔ ہمیں اپنے لئے موت چنی
 ہے۔ عزت کی یا ذلت کی۔“

اس نے سرخ آنکھوں سے مجموعے کی طرف دیکھا۔ وہ دھاڑا:
 ”بولو! عزت کی یا ذلت کی؟“

یہ سن کر سب حاضرین سناٹے میں آ گئے۔ غلام حیدر خان اس علاقے کا باشندہ
 نہیں تھا۔ یہ پر جوش نوجوان مہاراجا کے سپاہیوں اور ”دھرم رکھشکوں“ کی وحشت اور
 دہشت سے بچ کر اس علاقے میں اپنے خاندان کے ساتھ پناہ لینے کی غرض سے آیا تھا۔
 اس کی بات بہت سے لوگوں پر ناگوار گزری کہ وہ صلح صفائی سے معاملے کا حل چاہتے
 تھے۔

تنہی ایک اور نوجوان مجمعے کے بیچ سے کھڑا ہوا اور لاکر بولا:
 ”فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے۔“

غلام حیدر نے نظروں سے نوجوان کے سراپا کو ٹٹول کر پوچھا:

”کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

نوجوان نے فوراً نیام سے تلوار نکالی اور اسے ہوا میں لہراتے ہوئے بولا:

”ہمارا فیصلہ تلوار ہے۔ ہم ذلت کی موت قبول نہیں کر سکتے۔“

ہوا میں کئی تلواریں لہرائیں جن کی چمک سے سکھم چند کو جواب مل گیا۔



فقیر حسان

تاج کا نصیر الدین طوسی



بتیس دانتوں میں سے ایک میں درد ہو تو آدمی کا سارا بدن دکھنے لگتا ہے۔ پھر وہ سانس لینے سے بھی بلبلا اٹھتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بے چینی اور جھنجھلاہٹ مہاراجا اور مہارانی کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اتنی بڑی فوج، پولیس اور ”دھرم سیوکوں“ کے ہوتے بھی وہ ”ادھرمیوں“ کی ایک بستی کو خالی کرانے میں ناکام ہو گیا تھا۔ مہارانی تو کچھ زیادہ ہی تمللا رہی تھی۔ اسی وجہ سے ان باغیوں کو کیفرِ کردات تک پہنچانے کے لئے مہاراجہ نے ادھم سنگھ کو بلا بھیجا۔ ادھم سنگھ کو دیکھتے ہی مہارانی اس پر گر جنے لگی:

”ادھم سنگھ! کب تک؟ آخر کب تک یہ زہریلے سانپ اپنی بلوں میں چھپ کر پھنکارتے رہیں گے؟ کب تک ہمارے سورما ان کی پھنکار سن کر ایسے ہی ایک دوسرے پر گر پڑیں گے جیسے سپرے کے ہاتھ میں لہراتا ہوا سانپ دیکھ کر بچے گھبرا کر ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ کیا مندروں کی گھنٹیوں کی کھنک سے ہمارے سورما اتنے مست ہو گئے ہیں کہ تلواروں کی گچا گچ بھول گئے۔ کیا ہمارے گھڑسوار تلواریں اصطبل کی دیوار پر لٹکا کر اپنے گھوڑوں پر کھریا پھیر رہے ہیں؟ کیا ہمارے پیادوں کے نیزوں پر زنگ لگ گیا ہے اور وہ ناخنوں سے ان کی گھٹائی کر رہے ہیں؟ کیا ہماری بندوقوں کو لقوہ مار گیا ہے اور ان کے ٹیڑھے منہ سے بارود کے لقمے گر رہے ہیں؟ کیا ہم نے افسروں کے سینے پر بہادری کے

تمنے اس لئے لگائے ہیں کہ وہ زنانوں کی طرح بے تکلی باتوں پر ہنس کر انہیں کھکاتے پھریں؟ اور کیا ہمارے ”دھرم رکھشک“ ”ادھر میوں“ کی عورتوں کے ساتھ ہم بستی کر کے اپنی مردانگی پا جاموں میں تہہ کر کے ستارہ ہیں؟“

ادھم سنگھ بڑی خاموشی سے یہ سب سن رہا تھا۔ اس کے خیال میں مہارانی کا غصہ جائز تھا۔ مہارانی کو لگتا تھا کہ اس کے دشمن اس کے سینے کو مسل رہے ہیں اور وہ بے بسی سے دیکھ رہی ہے۔ مہاراجا کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ جلد سے جلد اس مسئلے کو نپٹانا چاہتا تھا۔ اس نے ادھم سنگھ کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

”کچھ کہتے کیوں نہیں ادھم سنگھ۔ تمہاری خاموشی کو ہم کس بات سے تعبیر کریں؟“

ادھم سنگھ ایک شیطانی منصوبہ لے کر آیا تھا۔ ایک ایسا منصوبہ جس پر عمل کرنے سے سانپ بھی مرے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے۔ بولا:

”مہاراج! آپ کے جاں نثار اپنے سر ہتھیلی پر لیے تیار ہیں۔ آپ کے سپاہیوں کے جوتے سانپوں کے پھن کچلنے کے لئے بیتاب ہیں۔ تلواریں گردنوں پر گرنے کے لئے چل رہی ہیں۔ نیزے آپ کے دشمنوں کے سروں کا بار اٹھانے کے لئے اچک رہے ہیں۔ بندوقوں کی گولیاں سینوں میں خون کے درے کھولنے کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ مگر اس علاقے میں پیش قدمی کرنا مناسب نہیں۔“

مہاراجا پر یہ بات ناگوار گزری۔ اس کی تیوری پر بل پڑتے دیکھ کر ادھم سنگھ ذرا سا گھبرایا مگر فوراً سنبھل کر بات آگے بڑھانے لگا:

”مہاراج! مناسب اس لئے نہیں کہ وہ کوئی بھانڈ نہیں کہ ہم نے طبل جنگ پر چوب ماری اور تھاپ پر تھرکتے ہوئے اپنی بندوقیں اور تلواریں ہوا میں لہرائے اپنی کمین

گا ہوں سے نکل کر ہمارے قابو میں آجائیں گے۔ وہاں جو بھری بندوقیں ہیں ان کی نال کوئی پھکنی نہیں کہ اٹھا کر بچوں کو ڈرایا۔ جو تلوار ہے وہ کوئی ناگ پھنی نہیں کہ ہاتھ پھیلا یا اور جڑ سے اکھاڑ دیا۔“

مہاراجا نے ادھم سنگھ کی بات کاٹتے ہوئے غصے میں کہا:

”ادھم سنگھ! آج تمہارے سست اور بے جان لفظوں کے لئے ہمارے پاس کوئی نذرانہ نہیں۔ کیا خلاصہ تمہارے بیان کا یہ تصور کیا جائے کہ ہم بزدلوں کی طرح اپنی بغلیں کھجاتے رہیں اور ہمارے دشمن ہمارے لئے محول کا ذریعہ بن جائیں۔“

ادھم سنگھ نے مہاراجا کے پھرے ہوئے تیور دیکھ کر مہارانی کی طرف دیکھا۔ مہارانی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ادھم نے نظریں جھکا کر تلوار کے دستے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا۔ جھجکتے ہوئے بولا:

”اس سے پہلے کہ مہاراج کا یہ اندیشہ سچ ثابت ہو ادھم سنگھ اپنا سر کاٹ کر ان کے چرنوں پر ارپن کرے گا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

مہاراجا غصے سے کانپتے ہوئے بولا:

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟ یہ گنجلگ کی بات ہمیں نہ سناؤ۔“

ادھم سنگھ سہمتے ہوئے بولا:

”مہاراج! نیزہ اگر بانہی میں گھس نہیں سکتا سانپ تو باہر آ سکتا ہے۔“

مہاراجا بھڑک اٹھا:

”ادھم سنگھ! کیا تم بھول رہے ہو کہ تم کہاں ہو؟ کس سے گفتگو کر رہے ہو؟ تمہاری

”مہاراج! ایائے محفوظ راہداری ہے۔“

ادھم سنگھ نے نیام سے تلوار کھینچ کر کہا:

مہارا جا غوطے میں یڑ گیا۔ بولا:

”منصوبہ تو صحیح لگ رہا ہے مگر انہیں اس بات پر آمادہ کون کرے گا۔ کیا اب بھی

اعتماد کی کوئی وجہ باقی ہے؟“

ادھم سنگھ کی شیطانی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بولا:

”ایک وجہ باقی ہے — فقیر خان۔“

مہاراجا نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کیں۔ کچھ سوچا پھر پوچھا:

”مگر ادھم سنگھ! فقیر خان اپنے لوگوں کے خلاف ہونے والی اس سازش کا حصہ

بننے پر کیسے آمادہ ہوا؟“

ادھم سنگھ نے تلوار نیام میں ڈالتے ہوئے کہا:

”مہاراج! سام، دام، ڈنڈ، بھید اڑیل سے اڑیل آدمی کو بھی زیر کر سکتے ہیں۔“

فقیر خان کس کھیت کی مولیٰ ہے۔ اس کے ساتھ معاملہ دام پر ہی نپٹ گیا۔“

اس سے قبل کہ مہاراجا کچھ بولتا مہارانی نے حکم صادر کیا:

”آگے بڑھو ادھم سنگھ! آگے بڑھو۔ فقیر خان اس خدمت کے لئے جو انعام چاہتا

ہے دیا جائے گا۔“

ایک بھیانک تہقے سے دیواروں پر لگی ہوئی مہاراجا کے پرکھوں کی تصویریں

چونک اٹھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مہارانی کے بدن میں ہلاکو کی بیوی دقوز کی آتما گھس گئی

اور قتل و غارت کی یہ دیوی اپنی تشنگی اور گر سنگی دور کرنے کے لئے منہ پھیلائے آگے بڑھ رہی

ہے۔

آدھی رات کو دور افت پر گلابی جاڑے کا چاند تاریخ کا ایک ورق آنکھوں پر رکھ

کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پر لکھا تھا:

”فدائیوں نے سخت مدافعت کی۔ دن بھر سخت لڑائی ہوئی۔ آدھی رات کو غلام

نے آقا سے غداری کی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے جان کی امان کے عوض قلعے کا دروازہ کھولنے کا وعدہ کیا۔ ہلاکو خان نے فوراً خواجہ کو امان دی۔ آدھی رات گزرتے ہی قلعہ الموت کا دروازہ کھل گیا۔“

چاند سو گیا اور تارخ جاگ رہی تھی کہ اسے کل خون کی نئی ہولی دیکھنی تھی۔



ہیبت خان

بندوق کی نال کی حرارت سے سکون پانے والا بیٹھان



پورے علاقے میں ضیاء الدین کی اپنے چھوٹے بھائی مولوی غیاث الدین کے تئیں محبت، شفقت اور عزت کی مثال دی جاتی تھی۔ پچیس برس کا ضیاء الدین ناخواندہ تھا مگر جاہل ہرگز نہیں۔ علم اور عالم کی قدر خوب جانتا تھا۔ چھوٹے بھائی کی رومی ٹوپی کا پھندا ہلتا تو ضیاء الدین کا دل خوشی سے بلیوں اچھلتا۔ لگائی لتری کرنے والے کم نہ تھے۔ دونوں بھائیوں کے اتحاد کو حسد کی نگاہ سے دیکھنے والے ہرچندان کے رشتے میں دراڑ ڈالنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے تھے مگر پتھر کی لکیر کو جتنا مٹانا چاہو اتنی ہی صاف ہو کر نمایاں ہو جاتی ہے۔

سیدہ سادا ضیاء الدین زمانے کی ایچ پیچ اور گورکھ دھندہ کچھ نہ سمجھتا۔ کبھی ٹھوکر کھاتا تو بیس برس کا چھوٹا بھائی سمجھاتا کم ڈانٹتا زیادہ تھا۔ مولوی غیاث الدین کی ڈانٹ ڈپٹ سے ضیاء الدین کی گھروالی مہتاب بیگم تلملا کر کہتی:

”مولوی تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ میں یہ کب کہتی ہوں کہ اس کی عزت نہ کرو۔ اس سے محبت اور مروت کا معاملہ نہ رکھو۔ مگر اتنا دبتے رہو گے تو کسی دن جوتے لے کر چھاتی پر

سوار ہو جائے گا۔“

یہ باتیں سن کر ضیاء الدین بگڑ بیٹھتا۔ خوب جب بک چج ہوتی تو گھر سے بھاگ جاتا اور کئی دن تک لوٹ کے نہ آتا۔ اندر اندر مولوی بھی اپنے چھوٹے بھائی سے از حد محبت کرتا تھا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علم جو انسان کو عاجز بنا کر خاک میں ملاتا ہے پھر کسی بدنصیب کو اسی علم سے برتری کا احساس ہو جاتا ہے۔

برتری کا یہی احساس انا کی دیوار کو سیسہ پلاتا ہے اور انسان جو اپنی ذات کے گرد یہ دیوار کھینچتا ہے تو اس کے پار سے کوئی اور صورت نظر نہیں آتی، کوئی صدا سنائی نہیں دیتی۔ مولوی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ جس دل سے بڑے بھائی کو محبت کرتا تھا اس میں کبھی عزت کا دریچہ نہ کھولا۔

یہی محبت اس وقت خون کے آنسو رونے لگی جب ایک قبائلی ہیبت خان نے ضیاء الدین کے سینے پر اپنا بھاری بھرکم پاؤں رکھا۔ ہیبت خان ایک مونڈھے پر بیٹھا غرار ہاتھا۔ مہتاب بیگم نے جب چیخ چاخ مچائی تو باشندے اس علاقے کے سینہ کو ٹٹے ہوئے گلی کو چوں سے امنڈ امنڈ کر آئے۔ پٹھان نے اپنے چاروں طرف ہجوم خلق دیکھا تو ترخ کر بولا:

”ادھر تم لوگ پنڈلیاں کھاتے اپنے والد کی میت میں آئے ہو؟“

اس نے بندوق ہوا میں لہرائی:

”ہٹو، دفع ہو یہاں سے۔“

لوگ ڈر کے مارے پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ پٹھان بندوق کی نال غیاث الدین کے پہلو میں گھسا کر اسے گد گدانے لگا۔ غیاث الدین کے چہرے پر

بے بسی دیکھ کر پٹھان کے منہ سے ٹھہکا کا نکلا۔ اس پر اس کے ساتھی بھی ہنسنے لگے۔ ہیبت خان اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولا:

”کیا نام بولا تھا تم نے؟ ہاں غیاث الدین۔ مولوی غیاث الدین۔ تو غیاث الدین تمہارے بھائی کے سینے پر پاؤں رکھ کر ہیبت خان پوچھتا ہے کہ اس خانہ خراب نے کافر کو کس بل میں ٹھونس کے رکھا ہے۔ ابھی میں پیار سے پوچھتا ہوں اگر مجھے غصہ آگیا تو اس کی اگلی پیچھلی پسلیاں پنچہ لڑانا شروع کریں گی۔“

پھر وہ بھیڑ سے مخاطب ہوا:

”اوائے بد بختو! ہم گھاس پھوس کے شور بے سے انتزیبوں کو غسل دینے والے بنے یا کنجڑے نہیں پٹھان ہیں پٹھان۔ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر پہاڑ کے ہیبت ناک دروں میں جنگلی بکروں کا شکار کرنے والے پٹھان۔“

پھر اس نے اپنی اکڑی ہوئی گردن بمشکل غیاث الدین کی طرف موڑ کر کہا:

”غیاث الدین تم کبھی ادھر آ کر ان دروں کو دیکھنا۔ واللہ وہ چکر آئیں گے کہ ساری عمر حاملہ خاتون کی طرح الٹیاں کرتے پھر وگے۔ سن غیاث الدین ہماری بندوق سے نکلی ہوئی گولی سے جب دشمن کے سینے میں آگ کا شعلہ لپک اٹھتا ہے تو ابلتے ہوئے خون سے زیادہ ہمیں اپنی بندوق کی نال کی حرارت سکون بخشتی ہے۔ ہماری تلوار مست سائڈ کی گردن ایک ہی وار میں بھٹاسی اڑا دیتی ہے۔“

اس نے چپل سے دایاں پاؤں باہر نکال کر انگوٹھا ہلایا۔ پھر بولا:

”تمہارے بھائی کی گردن تو چلغوزے کے چھلکے سے بھی پتلی ہے۔ اسے تو میں اپنے پاؤں کے ناخن سے ہی کاٹ سکتا ہوں۔ سمجھاؤ اپنے برادر کو سمجھاؤ، ورنہ اگر

میں مونڈھے سے اٹھا تو اس کے پھیپھڑے ٹوٹی ہوئی پسلیوں کی نوک سے چھلنی بن جائیں گے۔ تم وہ چھلنی لے کر اس سے آٹا چھاننا اور میرے لئے روٹی بنانا۔ ایک بات کہو غیاث الدین! تم نے دیکھا ہے جب غبارے کی مروڑی ہوئی گردن کے پیچ کھلتے ہیں تو کیسے پھس سے ہوا نکلتی ہے۔ اب ایسے ہی تمہارے برادر کے سینے میں پھنسی ہوئی آخری سانس نکلے گی۔ اوئے بد بختو! تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ ہم تمہارے سب کے باغوں سے طوطے اڑانے کے لئے بندوق لے کر آئے ہیں۔“

یہ غل غپاڑہ سن کر ضیاء الدین کا جگری دوست حیات محمد وہاں پہنچا۔ پہلے بھیڑ کے پیچھے سے اچک اچک کر دیکھنے لگا کہ کیا ماجرا ہوا ہے جو یہ لوگ جھلڑ بنا کر کھڑے ہیں۔ جب دیکھا کہ ضیاء الدین پٹھان کے چنگل میں پھنسا کر رہا ہے تو رہا نہ گیا۔ اپنی مخصوص مسخروں والی چال میں لہراتے بل کھاتے چل کے بیت خان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ ماتھے پر چپکا کر سلیوٹ کیا:

”سلام علیکم خان بھائی!“

پٹھان کی گرن تو اکڑی ہوئی تھی۔ نہایت ناگواری سے گردن اٹھا کر پوچھا:

”تو کون ہے خر بچہ؟“

یہ سن کر حیات محمد کو اپنے دادا کی یاد آئی۔ حیات جب پیدا ہوا تھا تو کہتے ہیں کہ اس کے جسم پر بہت سارے بال دیکھ کر اس کے دادا نے پیار سے اسے چکار تے ہوئے کہا تھا کہ ریچھ کا بچہ ہے تو۔ پھر جب تک دادا زندہ رہا اسے ریچھ کا بچہ کہہ کر پکارتا۔ حیات محمد نے سوچا کہ بیت خان نے بھی دلار سے خر بچہ کہا۔ بولا:

”خان بھائی! میں حیات محمد ولد ولی محمد ساکن _____“

خان نے بندوق کی نال اس کی طرف کر کے اسے ٹوکا:

”اوبد بختا! میں تیرا نام پوچھتا ہوں نامہ عیال نہیں۔۔۔ اچھا یہ بتا اس آدمی کو جانتا ہے؟“

حیات محمد نے مصافحہ کے لئے جو ہاتھ ہیبت خان کی طرف بڑھایا تھا اسے پیچھے کرتے ہوئے بولا:

”یہ ضیاء الدین ہے۔ میرا دوست۔“

ہیبت خان نے ماتھے پر تیوری چڑھا کر پوچھا:

”اچھا یہ بتا تیرا دوست ست لال کو جانتا ہے؟“

حیات محمد سمجھ گیا کہ خود مصیبت مول لی۔ ڈر کے مارے اس کا گلاسو کھنے لگا۔ تھوک نکلنے لگا۔ خان نے غصے سے پوچھا:

”چپ کیوں ہے خانہ خراب! جانتا ہے کہ نہیں جانتا؟“

حیات محمد نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا:

”جی جانتا ہے۔ بالکل جانتا ہے۔“

ہیبت خان نے لہجہ نرم کر کے کہا:

”اچھا یہ بتا۔ یہ تیرا دوست ست لال کو جانتا ہے، تو تُو بھی جانتا ہوگا۔“

حیات محمد کچھ دیر کے لئے ہڑبڑایا۔ لڑبڑا کر بولا:

”جی جانتا ہوں۔“

یہ سننا تھا کہ ہیبت خان نے ضیاء الدین کے سینے سے پاؤں ہٹایا اور حیات محمد کا گریبان پکڑ کر اسے بے تحاشا تھپڑ مارنے لگا:

”بول کہاں چھپایا ہے کافر کو؟ بول ورنہ کان میں بندوق کی نال گھسا کر بھیجا

اڑادوں گا۔“

ہیت خان کی دیکھی دیکھی اس کے ساتھی بھی حیات محمد پر پل پڑے۔ اس

افرا تفری میں ضیاء الدین چھوٹ گیا۔



عسلام شاہ

سکھ فوج لے کر گھات میں بیٹھے ہوئے جنک سنگھ کا ہم شکل



غلام شاہ نے ڈاڑھی منڈوائی — یہ سن کر لوگ ششدر رہ گئے۔ اس کا ڈھالے میں منہ چھپانا ڈاڑھی منڈوانے سے زیادہ وجہ تمسخر بنا۔ ستم ظریفوں کی کمی نہ تھی۔ کسی نے کہا ڈاڑھی منڈوانے سے شاہ کی صورت نکل آئی ہے۔ کوئی بولا کہ ہائے ظالم کیسا نازنین چہرہ گھونگٹ میں چھپائے پھرتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنے تیر۔ البتہ تنگ مزاج تھا لہذا کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وجہ پوچھے۔ بارے جب اس باب میں تحقیق ہوئی تو انکشاف ہوا کہ قبائلوں کے ڈر سے منہ پر استرہ پھیر دیا ہے۔

ہوایوں تھا کہ قبائیل سکھوں کے سرغنہ سردار جنک سنگھ کی تلاش میں مرے جارہے تھے۔ کسی بدخواہ نے انہیں خبر دی تھی کہ جنک سنگھ سکھوں کی فوج لے کر کہیں گھات لگا کر بیٹھا ہے۔ موقع ملے ہی دھاوا بول سکتا ہے۔ یہ خبر بھی تھی کہ جنک سنگھ اپنی ڈاڑھی کھولے مسلمانوں کے بھیس میں پٹھانوں کی سن گن لے رہا ہے۔ چنانچہ جنک سنگھ کے اشتباہ میں کئی لوگوں کی جانچ پڑتال ہوئی۔ اسے بد نصیبی ہی کہیے کہ غلام شاہ کی صورت جنک سنگھ سے ملتی تھی۔ چنانچہ ایک دن مخبر نے اس کی بھی نشاندہی کر دی۔ کہتے ہیں ابتدائی تفتیش تو پٹھانوں نے خود ہی کی مگر جب وہ مطمئن نہ ہوئے تو چوک والی مسجد کے پیش امام کو بلا بھیجا

کہ جانچ کے بتا مسلمان ہے کہ جنگ سنگھ۔ امام مذکورہ کے غلام شاہ کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے اس پر بھی پٹھانوں کے بیم سے اس طور پر تفتیش کی کہ دورانِ تفتیش غلام شاہ کو کئی بار خود شبہ ہوا کہ کہیں سچ مچ میں وہی جنگ سنگھ تو نہیں۔ کئی دن ڈر کی وجہ سے روپوش رہا۔ کہیں گاہ سے نکلا تو ڈاڑھی صفا چٹ تھی۔

بیوی اس کو گھر کی دہلیز پر دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ پوچھا:

”ڈاڑھی کہاں ہے؟ اور اتنے دن کہاں غائب رہے؟“

غلام شاہ نے آستین سے منہ ڈھانپ کر کہا:

”منڈوا دی۔۔۔ اب اور اس بارے میں پوچھا کچھ نہیں نہ کر۔“

بیوی نے حیرت سے پوچھا:

”مگر کیوں؟ کیوں منڈوا دی؟“

غلام شاہ آواز نیچی کر کے بولا:

”ارے احمق عورت! کسی سالے نے بولا ہی نہیں کہ میری صورت جنگ سنگھ

سے ملتی ہے۔“

بیوی نے پریشان ہو کر پوچھا:

”جنگ سنگھ؟ کون جنگ سنگھ؟ یہ کیا اول فول بک رہے ہو؟“

اس نے بیوی کے منہ پر ہاتھ دھر کر کہا:

”دھیما بول بیوقوف! جنگ سنگھ کا تو نام بھی زبان پر مت لا۔۔۔ سالہ خود تو

مرے گا، مجھے بھی مردائے گا۔ چل پرے ہٹ چوکھٹ سے۔“

یہ قصہ ماسٹر نیا ز محمد سے سن کے مولوی غیاث الدین ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ

ہو رہا تھا۔ آستین سے آنسو پونچھ کر بولا:

”بیچارہ غلام شاہ — ماسٹر جی! اگر بیٹھانوں کو خبر ملے کہ جنگ سنگھ ڈاڑھی منڈوا کر دندناتا پھر رہا ہے تب تو غلام شاہ کی اور سخت تفتیش ہوگی۔“

اس بات پر دونوں نے تہقہہ لگایا۔

ادھر ضیاء الدین بے چینی سے اس محفل کے برخاست ہونے کا منتظر تھا۔ بارے جب ماسٹر رخصت ہوا تو ضیاء الدین نے مولوی کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ چوکھٹ پر ہی رک گیا۔ مولوی نے پوچھا:

”بولو کیا ہے؟“

ضیاء الدین نے چھوٹے بچے کی طرح دیوار کی مٹی کھرچتے ہوئے کہا:

”وہ مولوی صاحب آپ اپنا گھوڑا دیتے تو —“

مولوی غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ بولا:

”کیوں ست لال کی بارات نکالنی ہے؟ ارے ان پڑھ، جاہل، عقل کے دشمن ست لال کی مدد کا انجام جانتے ہو؟ خدا کی قسم ننگا کر کے چوک میں لٹکائیں گے۔ کھولتا پانی ڈال کے چمڑی اتار دیں گے۔ خود تو پھانسی چڑھ ہی جاؤ گے ہمیں بھی ساتھ میں لٹکاؤ گے۔“

یہ سن کر مہتاب بیگم گھبرائی۔ مولوی کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا:

”مولوی! اٹھ کے چار جوتے مارو اس نادان کے سر پر مگر خدا را مکھم بولو۔ بات باہر نکلی تو قیامت برپا ہوگی۔“

مولوی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا پھر لہجہ نرم کر کے مہتاب بیگم سے کہا:

”اس سے پوچھو کہ کہاں چھپا کر رکھا ہے ست لال کو۔“

مہتاب بیگم نے اپنے شوہر کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:

”بت بنے کیا کھڑے ہو۔ کہتے کیوں نہیں؟“

ضیاء الدین نے بھول پن سے کہا:

”نہیں بتا سکتا۔“

اس پر مولوی تلملا اٹھا۔ منمناتے ہوئے بڑے بھائی کا تمسخر اڑایا:

”نہیں بتا سکتا۔“

پھر مہتاب بیگم سے مخاطب ہوا:

”لاٹ صاحب سے کہو کہ اصطلیل سے گھوڑا نکال کے اس بلا کو ہمارے سروں

سے ٹال کے آئے۔ ہونہہ مثل ہے کہ آندھی میں ہاتھی لرز رہے ہیں اور بوڑھی اماں

نکلی سوت کا تنے بیٹھی۔ احمق کہیں کا۔“

ضیاء الدین گردن جھکائے جانے لگا تو مولوی نے ٹوکا:

”رک جاؤ۔ کہاں جاؤ گے؟“

ضیاء الدین مہتاب بیگم کی طرف دیکھ کر بولا:

”اصطلیل میں۔“

مولوی نے دانت پیستے ہوئے کہا:

”مجھے ایک بات بتاؤ۔ جب عقل بانٹی جا رہی تھی تم نسوار منہ میں پھانک کے اونگھ

رہے تھے؟ یہ کوئی وقت ہے نکلنے کا۔“



ست لال

کمین گاہ سے محفوظ مقام تک



اندھیرا ہوا تو ضیاء اللہین گھوڑے کی راس پکڑ کر رکاب میں پاؤں رکھنے لگا کہ
 مہتاب بیگم نے گھوڑے کی ایال پر پیار سے ہاتھ پھیر کر پوٹلی تھائی:
 ”لو سنبھالو اسے۔ روٹیاں ہیں۔ کیا معلوم کتنے دن بھٹکنا پڑے۔“
 ضیاء اللہین نے پوٹلی زین پر رکھتے ہوئے پوچھا:
 ”مولوی اندر ہی ہے؟“
 ”نہیں۔“

مولوی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ مولوی نے گھوڑے کو چکارتے ہوئے کہا:
 ”مجھے تو اسی وقت شک ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے جب وہ ساند تمہارا
 گریبان پکڑ کر ست لال کے بارے میں تم سے پوچھتا چھ کرنے لگا تھا۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ
 کہیں تم دھمکی میں آکر کچھ اگل نہ دو۔۔۔ سن ضیاء شہر کی سڑکوں پر خطرے منڈلا رہے
 ہیں۔ اس لئے مصلحت اسی میں ہے کہ تین کوس تک دریا کا کنارہ پکڑ کر ناک کی سیدھ میں
 چل کے درد پورہ پہنچ جاؤ۔ وہاں گاؤں سے پرے ہی چکر کاٹ کر خیر پورہ کے کھیتوں سے
 ہو کر دھمال پورہ کی طرف نکلو جہاں پہاڑی کے دامن میں مددگاروں کی ایک ٹولی موجود
 ہے۔ بس اسی جگہ ست لال کو وداع کر کے واپس لوٹنا۔ ست لال کے سر پر اپنی دستار رکھنا۔

راستے میں اسے کلمہ یاد کرانا۔ کسی گاؤں میں مت اترنا۔ اب نکلو بھی خدا حافظ۔“

ضیاء الدین نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ پیچھے مڑ کر مولوی سے کہا:

”مہمان کو کھانا دے کر فوراً پلٹنا۔۔۔ مہتاب گھر میں اکیلی ہے۔“

یہ سن کر مولوی سناٹے میں آ گیا۔ ضیاء الدین نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی:

”ست لال کو میں نے اور حیات محمد نے خیر الدین کے گھر میں چھپا کے رکھا

ہے۔۔۔ اسے سب کلمے میں نے یاد کرائے ہیں۔“

مولوی غیاث الدین کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے ضیاء نے اس

کی چوری پکڑ لی۔ اس نے مہتاب بیگم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مہتاب بیگم مسکراتے ہوئے بولی:

”اتنا بھی ننھا نہیں تمہارا بھائی جتنا تم سمجھتے ہو۔ جس رات وہ مظلوم لڑکی روتے

بسورتے چوکھٹ پر تم سے پناہ کا سوال کر رہی تھی، ضیاء جاگا ہوا تھا۔ اور جب تم اسے باہر

لے کر گئے تو چھپتے چھپاتے تمہارا تعاقب کیا۔ وہاں سے لوٹا تو بولا: ”بزدل ہے مولوی۔۔۔

ایک دم بزدل۔ اس بیچاری بے سہارا لڑکی کو سب کے باغ میں لے جا کر ایک ٹوٹی پھوٹی

جھونپڑی میں چھوڑ آیا۔“ میں نے پوچھا تم کا ہے کو پیچھے پیچھے گئے؟ بولا: ”انسان کی نیت

دولت اور عورت کو دیکھ کر کب بگڑ جائے، پتہ نہیں۔۔۔ اور جو مولوی کی نیت میں کھوٹ

آ جاتا تو قسم بابا کی قبر کی ادھر ہی ڈھیر کر دیتا۔۔۔ روز تو پوچھتا ہے کہ ادھر کھانا گیا کہ

نہیں۔ پھر جب تم لوٹ کے آتے ہو تب ہی سو جاتا ہے۔۔۔ مولوی! تم اسے کہیں چھوڑ

کے کیوں نہیں آتے؟“

مولوی نے آہ بھری۔ بولا:

”نہیں بھابی ابھی حالات درست نہیں۔“

مہتاب بیگم کی آنکھیں ڈبڈبائیں:

”سچ کہتے ہو۔۔۔ میرا خدا اس نازک سی جان کی حفاظت کرے۔ اب یہ

پوٹلی لو اور جاؤ۔ اس کھٹاپٹی میں آدھی رات گزر گئی۔“

مولوی نے دریا کے کنارے پر اچانک آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند زرد ہو گیا

تھا۔ جیسے وہ بھی کسی جھونپڑی میں چھپا ہوا ڈر سے کانپ رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ خزاں زدہ پتے

کو اٹھا کر آسمان کے ماتھے پر تھوک سے چپکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مولوی سوچنے لگا:

”کتنا دردناک ہے اپنی آنکھوں سے اپنی جان سے پیاروں کے گلے پر چھری چلتے

دیکھنا۔۔۔ جب وہ بھاگی ہوگی تو کیا پہاڑ برابر غم کا بوجھ کاندھوں پر اٹھا کر بھاگ سکی

ہوگی؟ شاید باپ کی شہہ رگ سے خون کا فوارہ چھوٹنے سے پہلے اس نے یہی سنا ہوگا:

”بھاگ بیٹی بھاگ۔۔۔ تمہیں اپنے بھائیوں اپنی ماں اور معصوم بہن کی سر

کئی لاشوں کی قسم۔۔۔ میرے تھر تھراتے ہوئے جسم کی زردی کا واسطہ

۔۔۔ بھاگ اپنی عزت بچا۔۔۔“

رات مولوی کی آنکھوں میں اتر کے بھگنے لگی۔



بھورا

خون کا سمندر پار کر کے مالک کا حق نمک ادا کرنے والا کتا



وہ حزن تھا، خاموشی تھی کہ دہشت — شام کے زینے سے کوئی ایسی چیز اتر رہی تھی جسے محسوس کرنے کے باوجود پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ نیلے آسمان میں پیلا چاند دیکھ کر اُسے لگا کہ پوری کائنات زہر کھا کے زرد پڑ گئی ہے۔ دور دور تک بادل ایسے بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی نے آک کے ڈوڈے کو زور سے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اُسے باہر آ کر دیکھتے ہوئے بھورا لپک کے اُس کے قریب آیا۔ وہ اس کے پاؤں چاٹنے لگا — اور آسمان پر ایک ڈراؤ نے خواب کی بنت شروع ہو گئی۔

بھورا — بھورے کا نام اس وجہ سے بھورا پڑ گیا کہ اس کا رنگ بھورا تھا۔ بھورا باؤلا ہوتا تو مہاراج کے پاؤں پر ڈھیر ہو کر انہیں ہاتھی نظروں سے نہیں دیکھتا:

”مہاراج! یہ کتنا پاگل ہے — ہٹ جائیے۔“

ایک ”بلوان لٹھ“ ہاتھ میں لیے بھورے کی طرف بڑھا۔ مہاراج نے جھک کر بھورے کو چھو لیا۔ بھورا کے منہ سے جو آواز نکلی اسے سن کر مہاراج کو لگا جیسے اس کے کسی زخم میں ٹیس اٹھی۔ بھورا مہاراج کی گود میں چھپ گیا:

”بیٹا! راہ بھٹکنے والوں اور غیروں کی سرحد میں گھس پیٹھ کرنے والوں کو انسان ایسی ہی عبرت ناک سزا دیتے ہیں۔ منٹش بھی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ کسی اور سرحد میں گھس جاتا ہے مگر پر ماتما اسے ڈنڈ نہیں دیتا۔ چھما کرتا ہے۔“

مہاراج کے یہ بول سن کر مشتعل ہجوم واپس لوٹا۔ مہاراج نے قدم بڑھائے تو بھورا ہانپتے ہوئے ہوئے ہوئے سائے کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

پھر یہ ہوا کہ مہاراج جب ہون کے لئے کسی گاؤں سدھارتے تو بھورا ان کے لوٹنے تک صحن کی دیوار سے لگ کے ایسے پڑا رہتا جیسے زمین پر بھوری پڑی ہو۔ مہاراج کو دیکھنے پر وہ زمین کو اپنے پنجوں سے کھرچتے ہوئے زور زور سے بھونکنے لگتا۔ یہ اس کے شکوے اور احتجاج کا ڈھب تھا۔ پھر جب مہاراج اسے خوب چمکارتے تو بھورا خاموش ہو کر بھی کئی بار دیر تک ایسے بھونکتا جیسے کھانس رہا ہو۔ جیسے بتا رہا ہو کہ ابھی کچھ شکایت رہ گئی ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ بھورا نہ صرف مہاراج کی باتیں سنتا اور سمجھتا ہے بلکہ اس کی رسائی ان کی سوچ تک بھی ہے۔ رات کو مہاراج کروٹ بدلتے تو کھاٹ کی چُج مچاہٹ پر بھورا بھونکنے لگتا۔

اور پھر وہ دن بھی آیا جب بھورے کے سامنے قبائلیوں نے مہاراج کا سر قلم کیا اور اس نے مہاراج کی عصمت کا دامن پکڑ کر خون کا ایک سمندر پار کیا اور وہ بوڑھا ہو گیا۔ دوسرے کنارے پر پاؤں رکھے تو اسے لگا کہ اس کے پنجوں میں خون کی بوندیں جم گئی ہیں جو شیشے کے ریزوں کی طرح اسے کاٹ کر مسلسل لہولہان کر رہی ہیں۔ بھورا مہاراج کی عصمت کو ادا اس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو: ”اتنا مت رویا کرو۔“

پیڑوں کی شاخیں دیکھ کر اسے لگا جیسے کسی شیر نے بچے نے تصویر کے کپڑے رنگوں کو

دونوں ہاتھوں سے لتھیرا ہو۔ اس تصویر کے پردے میں ایک عجیب اداسی کا رنگ ابھر آیا تھا۔ پرندوں نے چہچہانا بند کیا۔ وہ اپنے اپنے گھونسلوں میں اپنوں کے ساتھ جانے کیا باتیں کرتے ہو گئے:

”پرندے رات کو کیوں نہیں چہچہاتے؟ شاید وہ انسانوں کو نیند میں خواب دیکھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور انسان _____ بندوق کی ایک گولی کے دھماکے سے ہزاروں پرندوں کے خواب توڑ دیتا ہے۔ رات کو جب پرندے کسی خوفناک آواز سے لرز کر بھرا مار کے اڑ جاتے ہیں تو ان کے بھراٹے میں کتنی دہشت ہوتی ہے۔“

یہ سوچ کے اس نے بھورے کی طرف دیکھا۔ تنہائی اور خوف جب حملہ کر کے انسان کو پسپا کرتے ہیں تو وہ اپنے قاتل سے بھی کہتا ہے:

”دو گھڑی میرے پاس بیٹھو _____ مجھ سے چار باتیں کرو۔ میری دو باتیں سنو _____ پھر جو مرضی وہ کر لو۔“

سورج ڈوب چکا تو دور افق پر ایک بادل لکیر کی طرح پڑا سرنخی میں نہا رہا تھا۔ حالانکہ یہ رنگ خوف اور دہشت کا ترجمان ہے لیکن جب سارے رنگ بجھ جاتے ہیں تو خون کا رنگ بھی آنکھوں کو اچھا لگتا ہے۔ اس کے دماغ میں پھر کسی سوچ نے کروٹ لی:

”رنگوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ جب مصور کسی مطلوبہ رنگ کی خاطر کئی رنگوں کو آپس میں ملا دیتا ہے تو کئی رنگ سانس لینا بند کرتے ہیں۔ کئی رنگ ایک رنگ بننے میں مصور کے منشا پر خود کو قربان کر دیتے ہیں۔ اپنا وجود مٹا دیتے ہیں۔ شاید عشق اور ایثار کا رنگ بھی ایسے ہی بن جاتا ہے۔ یہ بات آج تک کسی مصور کی سمجھ میں نہیں آئی _____ اور جو آتی تو ہر تصویر بولنے لگتی۔ قدرت نے کتنے رنگ تخلیق کیے مگر کبھی دو رنگوں کو آپس میں آمیز

کر کے دونوں کے وجود کو مٹانے کا کام نہیں کیا۔ دھنک میں سات رنگ ہوتے ہیں۔ ہر رنگ اپنی انفرادی چمک دمک کے ساتھ اپنے چھیلے چھیلے وجود کی گواہی دیتا ہے۔ اور شام جب آتی ہے تو گویا رنگوں کی دنیا پر گھات پڑتی ہے۔ ساری رات رنگ سانس لینے کی کوشش میں ڈھبڈباتے ہیں۔۔۔ ایسے جیسے ڈوبنے والا ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ کتنی دردناک ہوتی ہے یہ تڑپ۔

لیکن قدرت کے رنگ بڑے پکے ہوتے ہیں۔ موسم انہیں مار ڈالتا ہے۔ لیکن یہ موسم کو مات دے کر پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں۔۔۔ شاید اداس لوگوں کی آہوں کی جون میں۔۔۔

پیاس سے اس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ انسان کے پاس جینے کا وقت ہو تو زندگی کسی نہ کسی طور چلتی ہی رہتی ہے۔۔۔ ندی میں پانی ہو تو بہتی ہی رہتی ہے۔ اسے لگا کہ ندی غائب ہو گئی ہے اور اس کی جگہ ایک کالا ناگ پھنکارتے ہوئے بل کھا رہا ہے۔ پانی کے قلقل میں کتنی دہشت تھی۔۔۔ جسے میدان جنگ میں ہزاروں تلواریں میانوں سے سن سے نکل رہی ہوں۔ پانی میں کچھ خزاں زدہ پتے تیر رہے تھے جیسے سانپ کے جسم پر زرد زرد بندکیاں دمک رہی تھیں۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو اسے محسوس ہوا جیسے سسلاتے سانپ کی چکنی کھال کو چھوا ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جھٹک کر منہ پر رکھ لیے۔ آنکھوں سے ایک اور ندی رواں ہونے لگی۔

افق کو دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سرخ بادل کی لکیر اب سیاہ ہو کر بکھر گئی تھی۔ جسے کوئی دیو دھنک کو روند کر پہاڑ پر براجمان ہوا ہو۔ دور گاؤں میں ٹین کے کنٹر کھڑکنے لگے۔ خوف سے جب آواز حلق میں دب جاتی ہے تو ٹین کے کنٹر کھڑکنے

لگتے ہیں:

”ہوشیار! خبردار!! جاگتے رہو!!!“

”جاگتے رہو! جاگتے رہو!“

ہانک پکار کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے خود کو گھاس کے نیچے چھپا لیا۔ دور سیر ہوں ہوں کرنے لگے۔ جھونپڑی میں ایک بے بس اور مظلوم انسان کا دل خوف کی وجہ سے دھک دھک کر رہا تھا اور قدرت خاموش تھی۔ جیسے چوزہ چھبڑی کے نیچے تھر تھر کانپ رہا ہو اور سیر چھبڑی کی تیلیوں میں اپنے پنچے ڈال کے اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

ملگجا اندھیرا پیڑوں کے نیچے مٹی کے ڈھیلوں کی نوک پر پڑا کراہتے ہوئے دم

توڑ رہا تھا۔



سید جمال الدین

رکھوالوں کے پاؤں میں اپنی دستار ڈالنے والا بزرگ



اس گاؤں سے دور بہت دور جنوب میں شام ہوئی تو پہاڑ کا سایہ ماں کی مہربان
 اوڑھنی کی طرح پھیلنے لگا۔ اچانک گلابی جاڑے کی ہوا کا ایک تیز اور تند جھونکا خوابوں کے
 پیڑ جھنجوڑ کے سن سے گزر گیا۔ کتنے معصوم بچے ادھر ادھر بکھر گئے۔ ہانک پکار کا ایک سلسلہ
 یہاں بھی شروع ہوا۔ رات بیتی تو دہشت کا پہلا خنجر نئی صبح کے سینے میں اترا:

”حملہ آورو! خبردار۔۔۔ ہم سب ہیں تیار۔ سنو! سنو! مہاراجا ملک چھوڑ کے
 بھاگا ہے۔۔۔ وہ بزدل اپنی فوج اور کارندوں کے ساتھ فرار ہوا ہے۔ اب یہ ملک ہمارا
 ہے۔۔۔ کان کھول کر سنو اب یہ ملک ان کا ہے جنہوں نے جہلم میں خون کے چراغ جلا
 کر بہائے۔ حملہ آوروں کا ساتھ دینے والے غدار ہیں ان کا منہ کالا کر دیا جائے گا۔“
 ایک اور منادی ہوئی:

”خبردار! درڑوں سے جان بچا کر آنے والے پناہ گزینیوں پر کڑی نظر رکھو۔ ان
 کی ٹولیوں میں حملہ آوروں کے مخبر بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی بے بسی اور بے کسی ایک ڈھونگ

ہے۔ ان کو پناہ مت دو۔ یہ ہمارے لہو کے چراغوں کی لو پر پاؤں دھر کے ہمیں اندھیرے کے دوسرے دور میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔“

ایک اور دہشت ناک آواز نے دل دہلائے:

”سنو! کل جن ظالموں نے ہماری چڑی اتاری اب طاقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اب ہم ان کے جسموں کی کھال ادھیڑ دیں گے اور ان کی چربی سے چراغ جلا کر جہلم میں بہائیں گے۔“

پھر بغض و عناد کے یہ یزیدی کارندے رکھوالے بن گئے۔ انتقام کا جذبہ آنکھوں میں لہو بن کر اتر ا۔ فرضی ظالموں کو چوپالوں میں مشکیں کس کر مجرموں کی طرح کھڑا کیا گیا۔ پھر ایک بزرگ نے ایک رکھوالے کے پیروں میں اپنی ٹوپی ڈال دی:

”عبدالعزیز! تم میری بیٹی کو زبردستی بھگا کر لے گئے۔ دھونس دھمکی سے اس کے ساتھ زنا شوئی کا تعلق بڑھایا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے بیٹا جو میں نے کوتوالی میں تمہارے خلاف رپٹ لکھوائی۔ میرے گناہ کی سزا میرے بیٹے کو مت دو۔ اس بوڑھے کی عزت تمہارے پاؤں میں پڑی ہے۔ تمہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ میرے بیٹے کی رسیاں کھول دو۔ اس کی بوڑھی ماں غش کھا کے گر پڑی ہے۔ کہہ دو تو اس کی اوڑھنی بھی تمہارے پاؤں میں ڈال دوں۔“

پھر ایک لات سے بزرگ زمین پر گر کے ڈھیر ہو گیا:

”چپ منحوس بوڑھے۔“

آسمان پر مقدس رو حیں بین کرنے لگیں۔

پھر ایک گولی چلی اور گاؤں کی بہو بٹیاں دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے ڈر سے

کانپنے لگیں۔ رکھوالوں کی فوج کے ایک دستے کا سپاہ سالار گرجنے لگا:

”سید جمال الدین!“

گاؤں والے یہ سن کر منہ پیٹنے لگے کہ آج تک اس متبرک بزرگ کو کسی نے اس طرح اہانت آمیز لہجے میں نہیں پکارا تھا۔ سید ہڑبڑاہٹ میں سیڑھیوں سے گر کے عین سالار لشکر کے پاؤں پر ڈھیر ہو گیا:

”کیوں بے بوڑھے پھونس! منہ پھولتے ہوئے مجھے کیا دیکھ رہا ہے۔“

کہاں چھپا کے رکھا ہے حملہ آوروں کے مخبروں کو۔“

اس نے بزرگ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ بولا:

”کیا تم نے گمراہوں کا انجام نہیں دیکھا ہے۔ دیکھ بوڑھے! نصر بخت اپنے محل کی خاک منہ پر مل کر رو رہا ہے۔ قصر مامونیہ پر ماتم چھا گیا۔ مستعصم کی لاش ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر پھر وائی جا رہی ہے۔ تمہیں یاد نہیں کہ الف لیلیٰ کے شہزادے بیہرس بند قطار نے چنگیزی لشکر کے سالار قطبوغا سے کیا پوچھا تھا:

”اپنی سزا تجویز کر قطبوغا۔“

قطبوغا نے بے نیازی سے کہا تھا:

”ہم جن سرداروں کو گرفتار کرتے ہیں ان کے سر قلم کرتے ہیں تاکہ عبرت ہو اور

خوف دلوں میں قرار پکڑے۔“

بیہرس بولا تھا:

”ٹھیک ہے ہم تمہیں ہاتھی کے پیر کے نیچے کھال میں بند کر کے نہ ڈالیں گے اور

نہ یوسف سلجوقی کی طرح تمہاری بوٹیاں کاٹ کے تمہارے منہ میں ڈالیں گے۔ ہم بڑے

احترام سے تمہارے سر کو نیزے کی زینت بنائیں گے۔“

سید جمال الدین دیکھ رہے تھے کہ دور پر بستیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے اور ابراہیم ادہم دھند لکوں کو پار کر کے بستی میں اترے۔ انہوں نے اپنی گدڑی اتار کے ایک نیم سوختہ دوشیزہ کے بدن کو ڈھانپ دیا۔ دیوار اس خستہ مکان کی ان کے عصا کا بوجھ نہ سہ سکی اور گر کے مٹی کا ڈھیر ہوئی۔

”ازالزلت الارض زلزالها۔“

ابراہیم ادہم کا عصا بول اٹھا۔

”اے رب کعبہ! میری گھر کی عصمت کی حفاظت فرما۔“

سید جمال الدین نے دور پڑا عصا اٹھایا اور سر جھکائے سالار کے سامنے کانپنے

لگے:

”دیکھتے کیا ہو۔ گھر کی تلاشی لے لو۔ خبر ملی ہے کہ قبائلوں کے مددگار اسی مکان

میں چھپ کر بیٹھے ہیں۔“

سید نے ہاتھ جوڑے:

”عبدالعزیز! عبدالعزیز!! تمہیں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ اس بندوق

کی گولی میرے سینے میں اتار دو۔۔۔ اندر مستورات ہیں۔“

رکھوالے جب دندناتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے تو عورتوں نے غل مچایا۔ سید

جمال الدین نے اپنی دستار عزیز کے پاؤں میں ڈال دی:

”سالے بڈھے! تمہارے گھر میں مستورات ہیں تو ہمارے گھروں میں کون سی

رنڈیاں ہیں۔“

اس نے سید کے سینے پر لات رسید کی۔ اور سودا پکا ہو گیا۔ سید جمال الدین نے
 مستورات کے سب زیور عزیز کے پاؤں میں ڈال دیے۔ رکھوالوں نے اپنی اجرت وصول
 کی۔ پھر گاؤں گاؤں بہو بیٹیوں نے اپنے زیور پیش کر کے اپنی عصمتوں کا صدقہ اتار دیا۔
 ”حملہ آور و خبردار! ہم سب ہیں تیار۔ قبائلوں کا ساتھ دینے والوں کو عبرت

ناک سزا دو۔“

تاریخ کے افق پر ایک سرخ بادل پھریرے کی طرح لہرانے لگا جس میں کسان کا
 ہل ایسے چرمرار ہاتھا جیسے اس کی ہڈیوں پر بھاری چٹان رکھ دی گئی ہو۔



شیخ المخلد

قلعہ الموت کا دروازہ کھولنے والا



چاندنی رات میں دودھ کی نہر کے کنارے پر تھل تھل خرام کرنے والی نیم برہنہ حوریں جواہرات کے فرش کی چکنائی پر پھسلنے کے خوف سے ایک دوسرے کی باہ پکڑے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہیں۔ ایک حور کا پاؤں پھسل گیا اور وہ چھپاک سے ندی میں گر گئی۔ اور محل کی دیواروں میں دیر تک کھنکتی ہنسی کی جھانجن بجتی رہی۔ شیخ الجبل اپنے ریشمی ملبوس سے بے خبر ایک حور کی گود میں ہونٹوں کا شہد چکھ رہا ہے۔ کنیزیں اپنے منہ میں انگور کے دانوں سے بیچ نکال کر اسے منہ سے ہی کھلا رہی ہیں۔ مدہم روشنی میں بھیگے ایک چبوترے میں سازندوں کی جادوئی تان پر پرریاں رقص کرتے ہوئے عشق بیچاں کی بیلوں کی طرح بدن کو لچکا رہی ہیں۔ ہوائیں اس جنت کی عود و عنبر اور مئے ناب کی خوشبو سے مہک رہی ہیں۔ باد لے سے منڈھے ہوئے پیڑوں کی خوابیدہ شاخوں سے پرندے روئی کے گالوں کی طرح اپنے موتی جیسے پر چھٹکارہے ہیں۔ محل کے نیم تاریک گوشوں میں نوخیز جسموں کے انگ انگ میں کلیاں چٹک رہی ہیں۔

کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ غلام آقا کے ساتھ غداری کر کے جان کی

امان کے عوض قلعے کا دروازہ کھولے گا۔ پس قلعہ موت پر موت کے سائے لہرائے۔ نصیر الدین طوسی اپنے آقا سے نظریں چراتے ہوئے ایک وحشی بھیڑے کو جنت کی سیر کرانے لگا۔ وحشی ہلاکونے شیخ الجبل کے فدائین کو لاشوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے حکم دیا:

”مینار مسمار کر دو۔ کتابیں خاکستر کر دو۔ اس جنت کی ایک ہزار حوروں کو میں اپنی خواب گاہ کی زینت بناؤں گا۔ باقی حوریں لشکری آپس میں بانٹ لیں۔ جس حور سے دل بھر جائے اسے اٹھا کر قلعے سے نیچے پھینک دو۔ دو ہزار غلمان فوراً قتل کیے جائیں۔“

ہوائیں اس ویرانے کی خاک پھانک رہی تھیں۔ اس ہولناک محل کے ایک چبوترے پر بیٹھا بوڑھا وقت اپنی چند ہیائی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ایک ڈراؤنی چیخ کے ساتھ قلعے کا خستہ دروازہ کھلا۔ وقت نے ٹمٹماتی آنکھوں سے دیکھا تو چونک کر بڑبڑایا:

”شیخ الخلد؟ یہاں؟“



چندر لیکھا

”نارا“ کے خونخوار سپاہیوں کے چنگل سے بھاگی ابھا گن



اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ ندی کے کنارے پر آ کر بیٹھ گئی۔ پانی میں چاند کا لرزتا عکس دیکھ کر وہ چونک گئی۔ اس نے ماتھے کو ٹٹولا۔ اس کی بندیا کہیں کھو گئی تھی۔ اسے لگا جیسے اس بندیا کو کسی نے توڑ کر پانی میں بہایا ہو۔ اس کے سینے میں آہوں کا غبار اٹھنے لگا۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ چیخ چیخ کر چلا چلا کر رونا چاہتی تھی۔ مگر اس کے گلے میں جیسے پھندہ پڑ گیا:

”میرے چاند کے سینے میں خنجر ہے۔ میرے سورج کا گلا کٹا ہوا ہے۔ میرے تاروں نے ماتمی لباس پہنا ہے۔ میں نہ رات بن سکی اور نہ دن۔ کوئی آنے والا نہ آئے گا۔ کوئی آنے والا نہ آئے گا۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اس نے رضائی اوڑھ لی اور اپنے اوپر بہت ساری گھاس ڈال کر لیٹ گئی۔ ایک زندہ لاش گھاس پھوس کی قبر میں دفن ہو گئی تو دور سے ”ہوں ہوں“ کی صدا میں پھر سے آنے لگیں۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی سیار اپنے پنجوں سے چھبڑی کو ایک طرف ہٹا کر اس پر جھپٹ پڑا۔ بھورا کوئی آہٹ سن کر چونکنا ہو گیا۔ اس نے دور سے آتے ہوئے ہیولے کو پہچان کر پنجوں سے گھاس کی قبر کھودنا شروع

کیا۔ مولوی نے مدہم آواز میں اسے پکارا۔ وہ جیسے باؤلی ہو گئی۔ اس نے لپک کر مولوی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس کے ماتھے کو بے تحاشا چومنے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ مولوی بت بنا کھڑا رہا:

”ڈر گئی تھیں کیا؟“

مولوی نے اس کے شانوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے مولوی کا گریبان پکڑ کر کہا:

’اور نہیں تو کیا؟ نہیں ڈرتی؟ پتہ ہے شام سے بنی میرا دل عجیب وسوسوں میں ڈوبتا رہا۔ میں اس خوف سے مری جا رہی تھی کہ کہیں تمہیں کچھ ہوا نہ ہو۔“

مولوی نے اس کے بازو پکڑ کر اسے گھاس پر بٹھایا۔ وہ کھانے کے برتن سے لپٹی ہوئی مہتاب بیگم کی اوڑھنی کی گانٹھیں کھولنے لگا۔ بہت کوشش کے بعد جب اس سے مضبوط گانٹھ نہ کھلی تو چندر لیکھانے برتن اس سے لے کر اپنی گود میں رکھا اور اپنے دانتوں سے اس کی گانٹھیں کھولیں۔

وہ کھانا کھاتے کھاتے مولوی کی طرف کلنگی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ مولوی چاند کو گھور رہا تھا:

”ہوں تم نے بتایا نہیں کہ اتنی دیر کیوں ہو گئی۔“

اس نے مولوی کا گھٹنا جھنجھوڑ کر پوچھا۔ مولوی ذرا سا سرک گیا۔ بولا:

”وہ بڑے بھائی نے گھر میں ایک بکھیرا کھڑا کیا تھا۔ خیر چھوڑو وہ سب۔“

چندر لیکھانے پانی پیتے ہوئے کہا:

”اچھا یہ کہونا کہ کہنا نہیں چاہتے۔“

مولوی ہڑ بڑایا:

”نہیں چندر لیکھا! ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک ذرا سا معاملہ تھا جو نیٹ گیا۔“

”پتہ ہے مولوی!“

چندر لیکھا نے بھورے کی طرف ایک روٹی بڑھاتے ہوئے کہا:

”جب تم مجھے چندر لیکھا کہتے ہو تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ہمارے مہاراج جی

کہتے تھے —“

اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ مولوی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا:

”کیا کہتے تھے تمہارے مہاراج جی؟“

چندر لیکھا نے آستین سے آنسو پونچھے۔ سبکیاں لیتے ہوئے بولی:

”کہتے تھے ہمارے مہاراج جی کہ ایک زمانے میں نارانا نام کا ہمارے ملک کا

ایک راجا نیٹ ظالم، بد معاش اور اوباش تھا۔ اس کے کمرموں سے پر جا بہت پریشان تھی۔

اس کی بری نظر پڑ گئی سو اس نام کے ایک براہمن کی سندر اور سشیل لڑکی چندر لیکھا پر۔ اس

نے بہت کوشش کی کہ لڑکی اس کے بس میں آئے مگر اس کی اچھا پوری نہ ہوئی۔ پھر اس نے

ڈنڈ آزمایا اور لڑکی کو زبردستی اٹھانے کے لئے اپنے سپاہی بھیجے۔ — باپ اپنی بیٹی کو کسی

طرح سے بچا کر نکلا۔ اس نے سارا ماجرا اپنے دیوتا کو سنایا۔ دیوتا کو کرو دھ آیا اور اس نے

سارے ملک کا سروناش کیا۔ کئی دنوں تک دستا میں انسانوں کی جلی بھنی لاشیں تیرتی رہیں۔

چیل، کوئے اور گدھ غول در غول دستا پر منڈلاتے رہے۔ — مولوی! میں بھی چندر لیکھا

ہوں۔ وہ نبھاگی چندر لیکھا جس کو بچانے کے لئے سو اس کو اپنے پرانوں کی آہوتی دینی

پڑی۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مولوی بھی سبکیاں لینے لگا۔ اس نے اپنی اور ہنسی کے کونے سے مولوی کے آنسو پونچھے۔ بولی:

”مولوی! اب میری عزت بچانے کے لئے کوئی سوراں نہیں بچا۔ مجھے چاروں طرف نار کے خونخوار سپاہی نظر آرہے ہیں جو جنگلی کتوں کی طرح مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے دبوچ لیں تم مجھے اپنے دامن میں پناہ دے دو۔ مجھے اپنا لو مولوی۔ میں تمہارے چرنوں کی دھول بن کر رہوں گی۔“

یہ سن کر مولوی سناٹے میں آگیا۔ بولا:

”نہیں چندر لیکھا! ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ رکھوالے کو چور بننے پر مجبور نہ کرو۔ پھر دنیا میں کون ابھاگن کسی رکھوالے پر بھروسہ کرے گی۔“

”کیوں مولوی؟“

اس نے مولوی کا گریبان پکڑ کر پوچھا:

”میں سندر نہیں؟ تمہیں پسند نہیں؟ بولو مولوی!“

مولوی نے اپنا گریبان چھڑا کر کہا:

”یہ بات نہیں چندر لیکھا! تم بہت اچھی ہو۔ بہت خوب صورت ہو۔ تم دیوی ہو اور تم پر کسی دیوتا ہی کا حق ہے۔“

چندر لیکھا سمجھ گئی کہ مولوی کس بات سے خائف ہے۔ بولی:

”میں خوشی خوشی تمہارا دھرم سویکار کروں گی۔ مولوی ہو، خود نکاح کے دو لفظ چار گواہوں کی موجودگی میں پڑھو۔“

مولوی نے یہ سن کر سر جھکا یا۔ کچھ دیر سناٹا چھا گیا۔ اتنا سناٹا کہ بھورے کے

ہانپنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مولوی بولا:

”میں اپنے دین کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ میرا دین مجھے اپنی جان کی قیمت پر تم کو محفوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ تمہاری مجبوری سے فائدہ اٹھا کر تم سے نکاح کروں تو کل نبی صاحب ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جو بھی ہو، ہو تو تم مجبور ہی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایک دو دن میں تمہیں یہاں سے محفوظ مقام تک پہنچاؤں گا۔ اس کے آگے مجھ سے کوئی امید مت رکھو چندر لیکھا۔“

یہ سن کر چندر لیکھا مولوی کے پاؤں پر گری۔ مولوی سرک گیا:

”یہ ہمارے دین میں جائز نہیں چندر لیکھا!“

چندر لیکھا ہاتھ جوڑ کے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بولی:

”اس داسی کو ایک موقعہ تو دواپنے دیوتا کو خوش کرنے کا۔۔۔ آج کی رات

مجھے اپنے چرنوں میں بتانے دو مولوی۔“

”چندر لیکھا!“

مولوی کی آواز بھاری ہو گئی۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا:

”ہوش میں آؤ چندر لیکھا! ہوش میں آؤ۔ ہمارے درمیان ایک ننگی تلوار کی

دھار لکشمی کی طرح ہے جس کو پار کرنے سے ہم دونوں کٹ جائیں گے۔۔۔

میرے ایمان کا امتحان مت لو۔ ایک کشتی بان سے میرا معاملہ طے ہو گیا ہے۔ بس ذرا

موقعہ ہاتھ آئے تو میں اپنی نگرانی میں تمہیں محفوظ مقام پر چھوڑ آؤں گا۔“

چندر لیکھا نے اپنی کلائی سے سونے کا ننگن نکال کر مولوی کی طرف سرکایا:

”اسے رکھ لو مولوی ماٹھی اگر زیادہ اجرت مانگے تو مجبور مت ہونا۔۔۔“

مولوی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ننگن پہنایا:
 ”چندر لیکھا! ایک دم پگلی ہوتی۔ ابھی میرے گھر میں میرے بابا کی دستار موجود
 ہے۔ پیسے کم پڑ جائیں گے تو اسے نیلام کر دوں گا۔“
 چندر لیکھا نے مولوی کے پاؤں کس کر پکڑ لیے:
 ”مولوی۔۔۔“

مولوی نے اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے اور اس کے ماتھے کو چوما۔
 دورانق کے کنارے پر چاند ڈوبنے لگا۔ چاندنی کی گود میں وہ منظر، وہ لمحہ،
 جھینگروں کی جھانکیں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔



لکڑی

مغویہ عورتوں کے بٹوارے پر آپس میں لڑنے والے درندے



ایک آنکھ وہ تھی کہ فرات کے کنارے پر مشکیزے نے کھولی اور چھلک اٹھی۔
 ایک آنکھ وہ تھی کہ مشکیزہ بردار کے سینے میں کھلی اور چمک اٹھی۔ ایک آنکھ وہ کہ پیاس سے
 بلکتے ہوئے معصوم کے حلقوم میں تیرا لٹکنے پر سوئے فلک اٹھی۔ اور ایک آنکھ وہ کہ
 دیوار پر سوکھے چمڑے کی طرح لٹکنے والی مشکیزہ کی کھڑک سن کے ہمک اٹھی۔ جس مہارانی
 نے امنڈ امنڈ کے آنے والے بادلوں کی کوکھ سونی کرنے کے لئے ہون کرایا اسی کا حکم تھا
 کہ اگر پیاس سے تڑپتے ہوئے بچوں اور بزرگوں کے غم میں کسی کی آنکھ روئی تو اس کے
 خون سے تلوار کو اشانان دیا جائے گا۔

پھر شمر بولا:

”میں خُرم ہوں۔“

اور آسمان پر فرشتوں نے اس کے مکر پر تھوکا۔ اور یزید پر جہنم کی آگ تیز کر دی
 گئی۔ میدانِ کربلا نے کروٹ بدلی تو تاریخ کے زخم چھل گئے اور خون کی بہتی دھاروں کو
 سفاک رات سڑپ سڑپ چاٹنے لگی۔

وقار خان نے جب اپنے والد سعادت خان سے محفوظ راہداری کی تجویز کا ذکر کیا تو بیمار بزرگ کی آنکھیں ٹٹمٹمانے لگیں۔ خانہ بدوشوں کے اس بزرگ کو اس کا بیٹا علاج کے لئے شہر لایا تھا۔ بزرگ نے تھر تھراتی آواز میں کہا:

”جبکہ سرکار کے انتظامی امور میں دسترس رکھنے والے ہماری ذات کے افسروں کو سرعام قتل کیا جا رہا ہے، سڑنے کے لئے جیلوں میں بھر دیا جا رہا ہے، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ فقیر خان کو کس شرط پر جان کی امان ملی ہے۔ بیٹا! تیرا بوڑھا باپ جبکہ جنگل میں بادل گرج رہے ہوں دو کوس سے بھیڑیے کی آہٹ سن سکتا ہے۔ جبکہ خود رو پھولوں اور گھاس کی خوشبو کے لپٹے اٹھتے ہوں چار کوس سے اپنے شکار کی بوسو نگھنے والے بھالو کی بدبو محسوس کر سکتا ہے۔ جنگل ہمیں ماں کی گود سے اترتے ہی ہوا کی سائیں سائیں اور سانپ کی پھنکار میں فرق کرنا سکھاتا ہے۔ ہم خانہ بدوش ہیں تاریک رات میں کالی چٹان پر ریٹنے والے سیاہ سانپ کی سرسراہٹ سے بھی جاگ جاتے ہیں۔“

بزرگ کی سانس اکھڑنے لگی۔ وقار خان بولا:

”بس بابا! اب اللہ ہی بیلی ہے۔ ہمیں فقیر خان پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

سعادت خان نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”نہ نہ۔ ہرگز نہیں۔ مجھے فقیر خان کی تجویز میں سردرات میں بھوک سے پریشان بھیڑیے کے چلانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کی یقین دہانی گیدڑ کی چھال کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اسی وقت موت کا گھاٹ نظر آیا تھا جب وہ پہلی بار مزاج پرسی کے بہانے مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موت کا ایسا گھاٹ جہاں سان سے اتاری ہوئی تلواروں کی دھار بجلی کی طرح لپک رہی ہے۔“

بہر حال بزرگ کی بات بس بات ہی رہی۔ علاقے کے چاروں طرف مہاراجا کی فوج اجگر کی طرح کنڈلی مار کے بیٹھی تھی۔ پانی اور رسد کے سارے راستے مسدود تھے۔ جوش اپنی جگہ مگر مصلحت کہتی تھی کہ اگر فوج حملہ آور ہوئی تو محصوریں میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچ سکتا۔ فقیر خان کی یقین دہانی مشکوک تو تھی مگر ایک امید یہ بھی تھی کہ وہ اپنی ذات کے لوگوں کو دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔

سورج کے ماتھے پر دن میں خون کے کئی ٹیکے لگائے گئے اور جب وہ افق کے کنارے پر اپنا ماتھا پونچھ چکا تو شام کے پراسرار سائے میں ندی کے ساحل پر کوئی گھڑ سوار اتر۔ کون ہے یہ؟ قفقاز کا غدار داؤد؟ بغداد کا غدار ابن علقمی یا قلعہ الموت کا دروازہ کھولنے والا خواجہ نصیر الدین طوسی؟ شیخ الجبل خورشاہ گہری نیند سو رہا ہے۔ قفقاز کی پری روسوان موت کی کھائی میں کودنے کا بھیا تک خواب دیکھ رہی ہے اور ہلاکو شہزادی تھمر کو قالین پر تمکنت سے نیم دراز ہو کر دیکھ رہا ہے اس کی کمان وحشت کا سارا بل نکل رہا ہے۔ وہ شہزادی کے سامنے دوزانو بیٹھ کر سفید گھوڑی کے دادھ کی دوسری بالٹی حلق میں انڈیل رہا ہے۔ اس کے منہ سے انسانی لاشوں کی بدبو آرہی ہے۔ شہزادی اس کو حقارت سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے چنگیز کا پوتانہ ہو شہزادی کا غلام ہو:

”ہوس کا پوت۔ وحشی درندہ۔“

اور بغداد میں صبح کی پہلی کرن کے ساتھ فدائین کے آخری ساتھی نے عین ہلاکو خان کے خیمے کے سامنے اپنی جان نچھاور کر دی۔ ہلاکو خان نے حکم دیا:

”خليفة کو ایک سمور کے لبادے میں لپیٹ کر گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل کر مار ڈالا

جائے۔“

کسی نے دور سے آواز دی:

”غدار ابنِ علقمی وطن فروش تھا۔ اور فقیر خان؟“

تاریخ یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ ابنِ علقمی کے سامنے کاظمین شریف کو برباد کیا جا رہا

ہے۔

تیم درجا کے عالم میں کوچ کا اعلان ہوا۔ سرکاری لاریوں میں ٹھسٹھس بھرے ہوئے جبری مہاجرین نے جب پیچھے مڑ کے دیکھا تو انہیں لگا کہ وہ اپنی ماں کی گود سے جدا ہونے والے بچے ہیں۔ بزرگوں کی ڈاڑھیاں اور بیسیوں کی اوڑھنیاں ابھی آنسوؤں سے نم ہی تھیں کہ لاریوں کا رخ چھاؤنی کی طرف موڑا گیا۔ کاروان جب چھاؤنی کے نزدیک رک گیا تو چودھری رشید الدین نے فقیر خان سے کہا:

”فقیر خان رسول اللہ ﷺ کی امانت میں خیانت کر رہے ہو۔“

فقیر خان نے اپنی بندوق ایک سپاہی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”چودھری صاحب! آپ بڑے دسوا سی ہیں۔ دال روٹی کھا کر ہی روانہ ہوتے

ہیں۔“

یہ سن کر دو قارخان پھر گیا:

”فقیر خان ہم پہاڑی ہیں۔ تین کوس سے دھواں دیکھ کر بتاتے ہیں کہ الاؤ مل

رہا ہے یا چولھے پر روٹی پک رہی ہے۔ غدار کہیں کے۔“

چودھری رشید الدین ہڑبڑا ہٹ میں ایک لاری سے دوسری لاری تک دوڑتا ہوا

جان بچانے کی صلاح دینے لگا۔ بھگدڑ مچی تو چاروں طرف سے چٹاخ پٹاخ گولیاں چلنے لگیں۔ زمین پر بے گناہ جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں بچھ گئیں۔ جو بھاگ

سکے انہیں گاؤں میں سیوکوں نے آن لیا۔

اور جب مہارانی کو خون کی اس ہولی کی خبر ملی تو اس نے محل میں دیہ پا ولی منائی۔
 ساری رات راج محل کی منڈیروں پر دیے جھلملاتے رہے اور شہر سے دور کتے، بھیڑیے اور
 سیار ایک دوسرے کو کھدیڑتے ہوئے لاشوں کو جڑوں میں دبائے ادھر سے ادھر گھسنتے
 رہے۔ لکڑ بھگے مغویہ عورتوں کے بٹوارے پر لڑتے رہے۔
 (ختم شد)





اظہارِ تشکر:

- محترم دوست جناب رفیق را کا شکریہ جنہوں نے اس ناول کو سنا اور اپنے مفید مشوروں سے نواز۔
- اپنے محترم دوست جناب ظفر اقبال منہاس کا شکریہ جن سے میں نے کئی مقامات پر استفادہ کیا۔
- جناب خالد حسین کا شکریہ جن سے مجھے کچھ تاریخی واقعات معلوم ہوئے۔
- پرفیسر اسد اللہ وانی صاحب کا شکریہ جنہوں نے کچھ کئی مقامات پر میری راہنمائی کی۔
- اپنے محترم دوست جناب خالد بشیر احمد کا شکریہ جن کی کتاب ”دیدہ آبِ رواں“ کا مطالعہ میرے لئے کافی سودمند ثابت ہوا۔

- اپنے پیارے دوست پروفیسر پرکاش چند کا شکریہ جنہوں نے چند مفید مشوروں سے نوازا۔
- اپنے بڑے بھائی جناب غلام رسول کا شکریہ جن سے میں نے کئی مقامات پر استفادہ کیا۔
- اپنے بڑے بھائی جناب محمد شفیع خٹائی کا شکریہ کہ بعض مقامات پر راہبری کی۔
- اپنی بیگم ریحانہ اختر کا بھی شکریہ جنہوں نے مجھے اس کام کو انجام دینے میں حسبِ سابق حوصلہ دیا۔
- اس کے علاوہ اپنے عزیزوں جناب عمر فرحت اور جاوید رسول کا بھی شکریہ جنہوں نے اپنا تعاون ہمیشہ فراہم رکھا۔ اپنے صاحب زادے سید محمد سبزان خٹائی کا بھی شکریہ۔



DARIYA HAI CHASHM-E-GIRYA NAK

(Novel)

by : Dr. Shafaq Sopori



جناب شفیق سہلوی ایک اعلیٰ انسان، اعلیٰ باکمال شاعر اور بہت ہی مخیر دانش ور
ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اور کٹھنوں میں زندگی کی تلخیاں اور معاشرے کی بدلتا پیشوں کو
روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں ہندوستانی زندگی اور اس کے قدیم روایتی و مذہبی
عقائدات کا بھی خوب علم ہے۔ وہ بھارتی کشش کو بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ محنت کیا اور ہندو
اساتذہ کی خدماتیں تسلیم جیسے چھوٹے ناول میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ آدمی دای اور ملت ملتے سے
دلایہ خواتین کی صورت و ناموں سے کٹاؤ ہو یا ان کے ساتھ ظالم کلاسیہ یہ سب کچھ یہاں دیکھنے
کو ملتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ فلاںک رتیخ کو کثیر ۱۹۹۰ء کا مطالعہ کریں تو آواز اور ہوا کا شمیر کے
ہنگوتے حالات اور وہاں کے لوگوں پر ہونے والی زیادتیاں اس کا مضمون ہے۔ پھر یہ کہ ان
زیادتیوں اور مظالم کے سبب جو درد نمل اور صورت کے عوامل و عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں وہ بھی
اس ناول میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ شفیق سہلوی کے اور ایک ایسا شفیق کار ہے جو کہ ہمیشہ
ایک طرح کی انتظار کی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ جو چاند کو رب و استا ہے اُسے شفیق صاحب
اپنی شربانوں میں طویل کر کے شفیق ہندوستانی سے مشورہ فرما اس پر قسم کر دیتے ہیں۔
یہ جو نئی شفیق منظر عام پر آئی ہے اس کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد
طمینان کا احساس ہو رہا ہے۔ اللہ ان کے جود و طبع کو سلامت رکھے۔ (آمین)

پروفیسر کوشنہری

۲۲ فروری ۲۰۲۱ء

**EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE**
New Delhi, INDIA

ISBN 978-93-91238-91-9



978-93-91238-91-9

www.ephbooks.com

by : Dr. Shafaq Sopori

جناب شفیق سرپرہی ایک اچھے انسان، اچھے باکمال شاعر اور بہت ہی سنجیدہ کائناتدار ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اور کائناتوں میں زندگی کی تلخیوں اور معاشروں کی بدگمانیوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں جو روحانی زندگی اور اس کے قدیم رطاباتی و مذہبی عقائدات کا بھی خوب علم ہے۔ وہ طبیعت کی کائنات کو بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ محکوت کائنات اور جو اساطیر کی حقائق کو سمجھا جیسے چھوٹے بالوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ آدمی طاقی اور دولت مند سے طاقتور خواتین کی عزت و ناموس سے کتنا اذیتاں ان کے ساتھ مطالعہ کا یہ یہ سب کچھ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ فلاسفک ریجن کو کشمیر ۱۹۹۰ء کا مطالعہ کریں تو اور اور کتنا کچھ کچھ کے نگہ کرنے حالات اور وہاں کے لوگوں پر ہونے والی زیادتیوں اس کا مندرجہ ہے۔ پھر یہ کہ ان زیادتیوں اور زیادتیوں کے سبب جو درد و غم اور عزت کے عوامل و عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں وہ بھی اس بالوں میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ شفیق سرپرہی کے اور ایک ایسا شفیق کار ہے جو کہ ہمیشہ ایک طرح کی اعترافی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ جو چاروں کو رب و الہا ہے اُسے شفیق صاحب اپنی شریازوں میں شامل کر کے شفیقی ہر مندی سے مشغول قرار دے کر ہر قسم کو دیتے ہیں۔

یہ جو جنی شفیق منظر عام پر آ رہی ہے اس کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد ثنائیت کا احساس ہو رہا ہے۔ اللہ ان کے جود و بخشش کو سلامت رکھے۔ (امین)

پروفیسر کاظم مظہری

۲۲ فروری ۲۰۲۱ء

**EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE**
New Delhi, INDIA

ISBN 978-93-91238-91-9

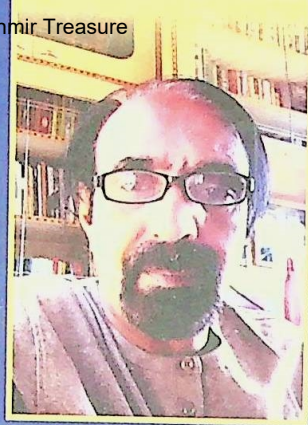


978-93-91238-91-9

www.ephbooks.com

DARIYA HAI CHASHM-E-GIRYA NAK (Novel)

by : Dr. Shafaq Sopori



جناب شفیق سوپوری ایک اچھے انسان، اچھے باکمال شاعر اور بہت ہی انجیدہ فکشن نگار ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری اور فکشن دونوں میں زندگی کی تلخیوں اور معاشرے کی بدقتاشیوں کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہیں ہندوستانی زندگی اور اس کے قدیم روایتی و مذہبی تناظرات کا بھی خوب علم ہے۔ وہ طبقاتی کشمکش کو بھی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ بھگوت گیتا اور ہندو اساطیر کی شعائیں نیلیما جیسے چھوٹے ناول میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ آدی داسی اور دلت طبقے سے وابستہ خواتین کی عورت و ناموس سے کھلوڑا ہوا ان کے ساتھ مظالم کا رویہ، یہ سب کچھ یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ فائرنگ ریج: کشمیر ۱۹۹۰ء کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کشمیر کے بگوتے حالات اور وہاں کے لوگوں پر ہونے والی زیادتیاں اس کا موضوع ہے۔ پھر یہ کہ ان زیادتیوں اور مسافیکوں کے سبب جو درعمل اور شدت کے عوامل و عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں وہ بھی اس ناول میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ شفیق سوپوری کے اندر ایک ایسا تخلیق کار ہے جو کہ ہمیشہ ایک طرح کی اضطرابی کیفیت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہ جو چار سو کرب و ابتلا ہے، اسے شفیق صاحب اپنی شریانون میں حلول کر کے تخلیقی ہنرمندی سے صفحہ قرماں پر مرسم کر دیتے ہیں۔ یہ جو نئی تخلیق منظر عام پر آ رہی ہے اس کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہوئے مجھے بے حد طمانیت کا احساس ہو رہا ہے۔ اللہ ان کے جودتِ طبع کو سلامت رکھے۔ (آمین)

پروفیسر کوثر مظہری

۲۲ فروری ۲۰۲۱ء

**EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE**
New Delhi, INDIA

ISBN 978-93-91238-91-9



978-93-91238-91-9

www.ephbooks.com